لوشان کی کہانیاں

1۔ پاگل آدمی کی ڈائری

2۔ چارہ

3۔ درے سے روانگی

4۔ بیوہ کا بیٹا

5۔ سیلاب

پاگل آدمی کی ڈائری

چینی کہانی

مصنف: لوشون

مترجم: خالد فتح محمد

دونوں بھائیوں کے ناموں کے بارے میں مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہائی سکول میں وہ میرے ہم جماعت تھے اور جدا ہونے کے بعد ہم ایک دوسرے سے رابطہ نہ رکھ سکے۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے پتا چلا کہ اُن میں سے ایک کی طبیعت کافی خراب ہے۔ اتفاق سے میں اپنے آبائی گھر جا رہا تھا۔ میں نے راستے میں رک کر اُن سے ملنے کا فیصلہ کیا لیکن میں ایک بھائی سے مل سکا جس نے بتایا کہ چھوٹے بھائی کی طبیعت خراب رہی تھی۔

''ایک طویل مسافت طے کر کے تمہارے یہاں آنے کو میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔''

اُس نے کہا ''لیکن میرا بھائی صحت یاب ہوکر اپنے سرکاری منصب پر کہیں اور جا چکا ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے اپنے بھائی کی ڈائری کی دو جلدیں اُٹھا لیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے بھائی کی بیماری کی تفصیل ڈائری سے معلوم ہو جائے گی۔ اُس نے یہ بھی باور کرایا کہ ایک پرانے دوست کو ڈائری پڑھانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں ڈائری ساتھ لے آیا!

ڈائری تفصیلاً پڑھنے کے بعد میں اِس نتیجہ پر پہنچا کہ کسی حد تک میرا دوست، خود اذیتی کے خبط میں مبتلا تھا۔ اُس کی تحریر بے ترتیب اور بے ربط تھی، اور بعض جگہوں پر مبالغہ آمیزی کا شکار ہو گئی تھی۔ ڈائری میں تاریخوں کے اندراج کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ صرف روشنائی کے رنگ اور لکھائی میں فرق ظاہر کرتا تھا کہ یہ مختلف اوقات کی تحریریں ہیں۔ بعض حصے ایک دوسرے سے مکمل طور پر علیحدہ نہیں تھے اور کچھ میں نے نقل کر لئے ہیں تا کہ ڈاکٹری تحقیق میں کام آ سکیں۔ میں نے ڈائری کی کسی بھی غیر منطقی فکر کو تبدیل نہیں کیا۔ صرف لوگوں کے اصلی نام ظاہر نہیں کئے گو وہ تمام گمنام اور غیر اہم سادہ دیہاتی تھے۔ صحت یاب ہونے کے بعد مصنف نے ڈائری کے عنوان کا خود انتخاب کیا تھا اور میں نے اسے جوں کا توں رہنے دیا۔

(I)

آج چاندنی جوبن پر ہے۔

تیس برسوں سے میں نے ایسی رات نہیں دیکھی۔ دل افزا چاندنی نے میرے اندر بھی شگفتگی کا نور کر دیا ہے۔ مجھے احساس ہونا شروع ہوتا ہے کہ پچھلے تیس سالوں سے میں اندھیرے میں زندہ رہا ہوں۔ اب مجھے محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ ورنہ چاؤ (Chao) کے گھر اُس کا کتا مجھے دو مرتبہ کیوں دیکھتا؟

میرا خوف بے سبب نہیں ہے!

(II)

آج اندھیری رات ہے۔

میں اِسے بدشگونی سمجھتا ہوں۔ کچھ یوں ہوا کہ میں جب ڈرتے ڈرتے باہر نکلا تو مسٹر چاؤ کو دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے خوفزدہ تھے اور مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ وہاں سات یا آٹھ اور لوگ موجود تھے اور وہ سرگوشی میں میرے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ غالباً وہ مجھ سے خائف تھے۔ میں جتنے بھی لوگوں کے پاس سے گزرا، مجھے یہی احساس ہوا۔ سب سے بھیانک شکل والا مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اُس مسکراہٹ نے میرے اندر ایک لرزہ طاری کر دیا۔ مجھے لگا کہ وہ اپنی تیاری مکمل کر چکے ہیں۔

میں اُن کی پرواہ کئے بغیر چلتا رہا۔ بچوں کے ایک ٹولے میں بھی میں موضوعِ سخن تھا۔ اُن کے چہرے زرد اور آنکھو میں مسٹر چاؤ والا تاثر تھا۔ میں حیران تھا کہ اُن کے ایسے شکایت آمیز رویے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ میں بے اختیار چیخ اُٹھا، ''کیا بات ہے!''

وہ تمام بھاگ گئے۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ مسٹر چاؤ اور سڑک پر موجود دوسرے لوگوں کو میرے ساتھ کیا شکایت ہوسکتی ہے؟ میں کوئی خاص وجہ یاد نہیں کرسکتا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے ایک دفعہ مسٹر کو چیو(Ku Chiu) کے پرانے کھاتے دیکھ لئے تھے اور وہ خاصے برہم بھی ہوئے۔ گو مسٹر کُو اور مسٹر چاؤ ایک دوسرے کے شناسا نہیں لیکن مسٹر چاؤ نے یہ افواہ سن کر مجھ سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ سڑک پر موجود لوگوں کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ بچوں کے رویے کو کیا کہا جائے؟ اُس وقت تو وہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اُن کا مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنا کچھ معیوب لگا۔ مجھے لگا کہ اِس کی وجہ خوف ہے اور کیا وہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟ یہ وہم مجھے خوفزدہ کر دیتا ہے، یہ واقعی حیران کن اور تشویشناک بات ہے۔

میں حقیقت جانتا ہوں! یہ بات اُنہیں اپنے والدین سے معلوم ہوئی ہوگی۔

(III)

میں رات کو سو نہیں سکتا۔ ہر بات کو سمجھنے کے لئے اُس پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اُن کی عجیب کیفیت تھی۔ اُن میں سے کچھ کو تو مجسٹریٹ نے بلّیوں سے بندھوا دیا۔ بعض کو مقامی شرفا نے منہ نہ لگایا۔ چند ایک کی بیویوں کو بیلف پکڑ کر لے گئے یا والدین نے قرض خواہوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ وہ اتنے سہمے ہوئے اور خوفناک کبھی بھی نظر نہیں آئے تھے۔

کل سب سے حیران کن بات ہوئی۔ ایک ماں نے سڑک پر اپنے بچے کی پٹائی کرتے ہوئے کہا۔ ''پاجی! اپنا غصہ کم کرنے کے لئے مجھے کئی بار تمہیں منہ بھر کر کاٹنا ہوگا۔'' لیکن تمام عرصہ وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ میں یکدم چونکا تو سبز چہروں اور لمبے دانتوں والے لوگ تحقر آمیز ہنسی ہنسنے لگے۔ بوڑھا چین(Chen) جلدی سے مجھے کھینچ کر گھر لے گیا۔

گھر میں سب لوگوں نے ظاہر کیا کہ وہ مجھے جانتے ہی نہیں۔ اُن کی آنکھوں میں ویسے ہی شکوک تھے۔ میں جب سٹڈی میں گیا تو ڈربے کی طرح دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ میں اِس واقعہ سے مزید حیران ہو گیا۔

کچھ دِن ہوئے ہمارے گاؤں وولف کلب(Wolf Club) سے ایک مزارع خراب فصل کی خبر دینے آیا تو اُس نے میرے بڑے بھائی کو بتایا، ایک بدنامِ زمانہ ہستی کو جان سے مار دیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے اُس کا دِل اور کلیجی نکال کر گھی میں تلا اور پھر مزے سے کھا گئے۔ اِس کا مقصد اپنے آپ کو زیادہ بہادر بتانا تھا۔ میں نے اُنہیں ٹوکا تو مزارع اور میرے بھائی نے مجھے عجیب نظروں سے گھورا۔ مجھے آج احساس ہوتا ہے کہ اُن کی نظر میں باہر کے لوگوں سا تاثر تھا۔

یہ سوچ کر میرے بدن میں خوف سے کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

وہ انسانوں کو کھاتے ہیں اور ممکن ہے مجھے بھی کھا جائیں۔

عورت کا اپنے بچے کو کہ وہ منہ بھر کر اُسے کاٹ کھائے گی، سبز چہروں اور لمبے دانتوں والے

لوگوں کا.....اور مزارع کا کل والا واقعہ دراصل خفیہ علامتیں ہیں۔ میں اُن کی باتوں میں زہر کے نشتر محسوس کرسکتا ہوں۔ اُن کے قہقہوں میں پنہاں خنجر میری سوچ میں چبھ رہے ہیں۔ اُن کے دانت سفیدی سے چمک رہے ہیں اور وہ تمام آدم خور ہیں!

میں جانتا ہوں کہ میں بُرا آدمی نہیں لیکن مسٹر کو کے کھانے والے قصے کے بعد معاملہ بہت نازک ہوگیا ہے۔ ظاہراً اُن کے اپنے راز ہیں اور یہ راز میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ غصے کی حالت میں وہ ہر کسی کو بدکردار سمجھتے ہیں۔ کچھ عرصے سے بڑے بھائی نے مجھے مضمون لکھانا شروع کئے۔ میں جب بھی کسی اچھے آدمی کی خامیوں کو اجاگر کرتا تو ایسی تحریر اُسے ہمیشہ بھاتی۔ اگر میں برے آدمی کی برائی کو نظرانداز کر دیتا تو وہ اُس مضمون کی بھی تعریف کرتا۔ میں لوگوں کے راز کیسے جان سکتا ہوں، خصوصاً جب وہ اوروں کو زندہ کھانے پر تلے ہوں۔

ہر بات کو سمجھنے کے لئے اُس پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت پہلے لوگ انسانوں کو کھا جاتے تھے۔ مجھے یہ بات کسی دھند میں اٹکی محسوس ہوتی ہے۔ میں نے تاریخ کی کتابوں میں ڈھونڈھنے کی کوشش کی لیکن اِسے کسی تاریخی ترتیب میں نے لا سکا۔ ہر کتاب کے ہر صفحے پر مجھے ''پاکیزگی اور اخلاقیات'' لکھے نظر آئے۔ اُس رات میں سو نہ سکا اور آدھی رات تک بہت توجہ سے پڑھتا رہا۔ ایک وقت آیا کہ مجھے تمام کتابوں میں لائنوں کے درمیان کی خالی جگہ میں صرف دو لفظ واپس گھورتے نظر آنے لگے۔ وہ الفاظ تھے، ''لوگ کھاؤ۔''

کتاب میں لکھے ہوئے اور ہمارے مزارع کے منہ سے نکلے الفاظ میری طرف ایک پراسرار مسکراہٹ سے دیکھنے لگے۔ میں ایک آدمی ہوں اور وہ مجھے کھانا چاہتے ہیں۔

(IV)

صبح کو میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ بوڑھا چین دوپہر کو میرے لئے سبزی کا پیالہ اور ابلی ہوئی مچھلی کھانے کو لایا۔ مچھلی کی آنکھیں سفید اور سخت تھیں اور منہ انسانوں کو کھانے والے لوگوں کی

طرح کھلا ہوا تھا۔تھوڑا کھانے کے بعد میں تذبذب میں پڑ گیا کہ نوالے مچھلی کے تھے یا انسانی گوشت کے۔ یہ خیال آتے میں نے قے کردی۔

میں نے بوڑھے چین کو بتایا، وہ میرے بھائی کو اطلاع کرے کہ میرا دم گھٹ رہا تھا اور مجھے باغیچے میں ٹہلنا چاہئے۔چین خاموشی سے باہر چلا گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے دروازہ کھول دیا۔

میں نے کوئی حرکت نہ کی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اُن کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے باہر نہیں جانے دیں گے۔میرا اندازہ درست نکلا۔ میرا بڑا بھائی ایک بوڑھے کو ساتھ لایا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی۔ بوڑھے آدمی کو خدشہ تھا کہ میں اس کے تاثرات جان جاؤں گا چنانچہ وہ نظریں جھکا کر اپنے چشمے کے کونوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''تم آج بالکل ٹھیک لگ رہے ہو'' میرے بھائی نے کہا۔

''ہاں! میں نے جواب دیا۔

''میں نے مسٹر ہو(HO) کو تمہارے معائنے کے لئے بلایا ہے''۔میرے بھائی نے اطلاع دی۔

''ہوں''۔ دراصل میں جان گیا تھا کہ بوڑھا جلدی میں ہے۔ وہ میری نبض یہ جاننے کے لئے دیکھنا چاہتا تھا کہ میں کتنا موٹا ہوں اور میرے گوشت سے اسے کتنا حصہ ملے گا۔ میں آدم خور تو نہیں لیکن ان سے بہادر ضرور ہوں۔ میں نے اس کا ردعمل جاننے کے لئے اپنی دونوں کلائیاں اُس کی طرف بڑھا دیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ہاتھوں سے اِدھر اُدھر کچھ محسوس کیا۔تھوڑی دیر خاموش بیٹھنے کے بعد اس نے اپنی متجسس آنکھیں کھولیں۔

''زیادہ پریشانی مناسب نہیں۔ چند روز آرام کرنا چاہیے! میرا وزن جتنا بڑھا اُنہیں کھانے کو اُتنا ہی زیادہ ملے گا۔لیکن یہ سب میرے کس کام کا یا ہر چیز کیسے بہتر ہوسکتی ہے۔ یہ لوگ انسانی گوشت کھانا چاہتے ہیں مگر ظاہری طور پر وہ خود کو بے اعتنائی کے لبادے میں لپیٹے ہوئے

ہیں۔اُن کی کوشش ہے کہ اپنے ارادے کسی پر ظاہر نہ کریں۔ یہ سب مجھے سوانگ لگا اور میں ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے والا ہوگیا۔میرے لئے یہ کافی مضحکہ خیز تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس قہقے میں بہادری اور راست بازی تھی۔ میری اس بہادری سے راست بازی سے بوڑھے اور میرے بھائی کے چہرے زرد ہوگئے۔

وہ جان گئے ہیں کہ میں بہادر ہوں۔مری بہادری کی وجہ سے وہ مجھے کھانے کے لئے بے چین ہوگئے ہیں تا کہ میرا گوشت بھی اُنہیں کہا بہادر بنا سکے۔ بوڑھا باہر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے آہستہ سے میرے بھائی کے مان میں لیا کہ مجھے فوراً کھا لینا چاہیے۔ میرے بھائی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے پتا چل گیا ہے کہ وہ ان سے ملا ہوا ہے۔ یہ حیرت انگیز انکشاف میرے لئے صدمہ سے کم نہیں تھا۔ میرا اپنا بھائی مجھے کھانے کے منصوبے میں شامل تھا۔

انسانی گوشت کھانے والا میرا بھائی ہے!

میں انسانی گوشت کھانے والے کا چھوٹا بھائی ہوں!

مجھے دوسرے کھا جائیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں انسانی گوشت کھانے والے کا چھوٹا بھائی ہوں۔

(V)

پچھلے چند دنوں سے میں پھر یہی سوچنے لگا ہوں۔ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ بوڑھا آدمی جلاد ہونے کے بجائے واقعی ڈاکٹر تھا۔لیکن پھر بھی وہ انسانی گوشت خور تھا۔اُس پیش رو لی شی چین (Lee She chan) نے جڑی بوٹیوں پر اپنی کتاب ''میٹیر یا میڈیکا'' میں بہت واضح طور پر لکھا ہے کہ انسانوں کے گوشت کو ابال کر کھایا جا سکتا ہے چنانچہ بوڑھا کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ انسانی گوشت نہیں کھاتا!

میرے بڑے بھائی کے متعلق خدشات حقائق پر مبنی ہیں۔وہ جب مجھے پڑھایا کرتا تھا تو اس

نے بہت واضح طور پر بتایا تھا کہ لوگ کھانے کے لئے اپنے بیٹے ایک دوسرے سے تبدیل کر لیتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک برے آدمی کے متعلق بحث کرتے ہوئے اس نے کہا کہ نہ صرف اسے قتل کر دینا چاہیے بلکہ اس کی کھال کو سونے کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔ اس وقت میں کم عمر تھا اور خوف کے مارے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس دن ہمارے مزارع نے گاؤں میں آدمی کا دل اور کلیجی کھانے والا سنایا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ وہ اسی طرح ظالم تھا۔ کھانے کے لئے بیٹے تبدیل ہو سکتے ہیں تو کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ماضی میں، میں اس کی توجیحات بے خیالی سے سنتا رہتا تھا لیکن اب جب وہ اس نوعیت کی بات کرتا تو اس کے منہ کے کونوں پر انسانی چربی نظر آتی۔ وہ انسانی گوشت کھانے پر تُلا ہوا ہوتا تھا۔

(VI)

گھپ اندھیرا! میرے لئے دن اور رات میں تمیز کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ چاؤ خاندان کے کتے نے پھر بھونکنا شروع کر دیا ہے۔

شیر کی ہیبت خرگوش کی کمزوری اور لومڑی کی مکاری.....

(VII)

میں ان کا لائحہ عمل جان گیا ہوں۔ منفی نتائج کے پیش نظر وہ کسی کو کُھلے بندوں قتل نہیں کر سکتے۔ اُنہوں نے گٹھ جوڑ کر کے میرے لئے اس طرح جال بچھا دیئے ہیں کہ میں خودکشی کر لوں۔ آدمیوں اور عورتوں کا گلیوں میں طریقہ اور بھائی کا پچھلے چند دنوں سے رویہ، میرے لئے بہت واضح اشارے ہیں۔ وہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ آدمی اپنی بیلٹ کا پھندا بنا کر چھت سے لٹک جائے۔ ایسی حالت میں وہ اسے سیر ہو کر کھائیں اور قتل کا الزام بھی ان کے سر پر نہیں آئے گا۔ ایسی حالت میں وہ دلچسپی اور سکون کے قہقہے لگاتے۔ بعض اوقات کوئی فکر اور پریشانی سے لاغر ہو جائے تو بھی یہ اسے کھانے سے دریغ نہیں کریں گے۔

وہ صرف مردہ گوشت کھاتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ہائینا (Hyena) کے بارے میں پڑھا تھا۔ یہ کریہہ صورت جانور مردہ گوشت کھاتا ہے۔ یہ بڑی سے بڑی ہڈی کو چبا کے ریزہ ریزہ کر کے نگل جاتا ہے۔ یہ خیال مجھے خوفزدہ کر دینے کیلئے کافی ہے۔ ہائینا بھیڑیوں کے رشتہ دار ہیں بھیڑیئے کتوں جیسے۔ کچھ دن اُدھر چاؤ خاندان کے کتے نے متعدد بار مجھے دیکھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کے یہ بھی منصوبے کا حصہ ہے اور بوڑھے نے اپنی نظریں تو نیچے رکھیں لیکن وہ مجھے دھوکا نہ دے سکا۔

میرے بھائی کا رویہ قابل مذمت ہے۔ آدمی ہوتے ہوئے اس کا خائف نہ ہونا مجھے کافی کھٹکتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ وہ اوروں کے ساتھ مل کر مجھے کھانے کی منصوبہ بندی کیوں کر رہا ہے؟ کیا جب کوئی اس کا عادی ہو جائے تو وہ اسے جرم نہیں سمجھتا؟ کیا اس کا دل پتھر ہو گیا ہے کہ جو غلط کام کرنے کو بھی معیوب نہیں سمجھتا؟

آدم خوروں پر لعنت بھیجنے کا آغاز میں اپنے بھائی سے کروں گا اور انہیں باز رکھنے کا بھی!

(VIII)

دراصل ان دلائل سے انہیں قائل ہو جانا چاہیے تھا

اچانک کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر تقریباً بیس برس کی تھی۔ اس کے نقوش صحیح طرح نہ دیکھ سکا۔ اس کا چہرہ مسکراہٹ میں نہایا ہوا تھا۔ جب اس نے سلام کرنے کے لئے سر ہلایا تو مجھے وہ مسکراہٹ مصنوعی لگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا انسانوں کو کھانا واجب ہے؟''

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا'

''اگر قحط نہ ہو تو انسانوں کو کیسے کھایا جا سکتا ہے''۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ اس کا تعلق اسی لوٹے سے ہے لیکن پھر بھی میں نے ہمت کر کے اپنا سوال دہرایا

''کیا یہ مناسب ہے''؟

''تم ایسی بات کیوں کرتے ہو؟ یقیناً تم مذاق بہت اچھا کر لیتے ہو.....آج بہت اچھا موسم ہے''۔

''موسم اچھا ہے۔ چاند بھی چمک رہا ہے لیکن مجھے بتائیں کہ کیا یہ مناسب ہے''۔

وہ ذرا تعلق سا گیا۔

وہ بڑبڑایا'

''نہیں''

''نہیں؟ لیکن پھر بھی وہ ایسا کیوں کرتے ہیں''۔

''تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں''۔

''میری باتیں سمجھ سے باہر ہیں؟ وہ وولف کلب میں آدمیوں کو کھا رہے ہیں۔ آپ یہ کسی بھی کتاب میں پڑھ سکتے ہیں.....تازہ اور سرخ حروف میں لکھا!''

اس کے مصنوعی رویے میں بکلخت تبدیلی آ گئی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا۔

''شاید ایسا ہی ہو'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا ''ہمیشہ سے ایسے ہی رہا ہے.....''

''کیا یہ اس لئے درست ہے کہ ہمیشہ ایسے ہی رہا ہے؟''

''میں اس سلسلے میں مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ ایسی گفتگو کرنا ہے ہی غلط۔''

میں نے جھٹکے سے اُٹھ کر اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ آدمی غائب ہو چکا تھا۔ میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میرے بھائی سے عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود وہ اس سازش میں شامل تھا۔ یہ اس نے اپنے والدین سے سیکھا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ سکھا دیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اِردگرد کے بچے بھی مجھے ایسی شدت سے دیکھتے ہیں۔

ان کے شکوک کسی سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔ آدمیوں کو کھانے کی خواہش اور ساتھ ہی خود کھائے جانے کا خدشہ.....

اُن کی زندگی پرسکون ہو جائے بشرطیکہ وہ اس جنون سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ اس قدم کے اُٹھاتے وہ آرام سے گھومنے پھرنے، کھانے پینے اور سونے لگیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ باپ بیٹے، خاوند اور بیویاں، بھائی، دوست، اساتذہ، شاگرد، دشمن، اور اجنبی ایک دوسرے کو ایسا قدم اُٹھانے سے منع کر رہے ہیں۔

(X)

آج صبح میں اپنے بھائی سے ملنے گیا۔ وہ ہال کے باہر آسمان کی طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ دروازے اور اُس کے درمیان کھڑے ہو کر میں نے اسے سکون اور نرمی سے مخاطب کیا'

''بھائی! میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں''۔

''ہوں.....کیا ہے؟'' وہ تیزی سے میری طرف مڑا۔

''بات تو مختصر ہے لیکن میرے لئے کہنا اتنا آسان نہیں۔ آغاز میں کہنا چاہوں گا کہ قدیم لوگ انسان کا تھوڑا تھوڑا گوشت کھا رہے تھے۔ پھر ان کا نظریہ تبدیل ہو گیا۔ کچھ نے کھانا چھوڑ دیا اور اچھائی کو کھوجتے اچھے آدمی بن گئے بعض ابھی تک کھا رہے ہیں..... رینگنے والے جانور کی طرح۔ چند ایک مچھلیوں، پرندوں، بندروں اور آخر کار آدمیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ لیکن کچھ کو اچھا بننے کی خواہش نہیں ہے اور وہ ابھی تک رینگنے والے جانور ہیں۔ آدمی کو کھانے والے، عام آدمیوں سے اپنا مقابلہ کرتے وقت شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہوں گے غالباً رینگنے والے جانوروں کا بندروں کے سامنے شرمسار ہونے سے بھی زیادہ۔

پرانے وقتوں کی کہانی[1] مشہور ہے کہ یی یا(Yi ya) نے اپنے بیٹے کو، چی(Chiech) اور چاؤ(Chou) کے کھانے کے لئے اُبالا اور پان کو(Pan ku) کے زمین اور جنت بنانے کے بعد

سے آدمی ایک دوسرے کو کھاتے آئے ہیں۔ پی یا کے بیٹے سے سوسی لن(Hsu Hsi-lin) تک اور سوسی[2] لن سے ہمارے گاؤں وولف کلب میں پکڑے گئے آدمی تک۔ پچھلے سال شہر میں کسی کو موت کی سزا دی گئی اور ایک ٹی بی کے مریض نے اُس کے خون میں روئی کے ٹکڑے کو بھگو کر کھایا۔

''وہ مجھے کھانا چاہتے ہیں اور تم اکیلے انہیں روک نہیں سکتے۔ ٹھیک ہے.....لیکن تمہیں ان کے ساتھ شامل نہیں ہونا چاہئے۔ آدم خور ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر وہ مجھے کھا سکتے ہیں تو وہ تمہیں بھی کھا جائیں گے بلکہ وہ ایک دوسرے کو بھی کھا سکتے ہیں۔ تم اپنے آپ کو سدھار لو تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں مانتا ہوں کہ یہ ہزار ہا سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے لیکن اس سلسلے کو ہمیں اب آگے نہیں چلنے دینا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ اس دن جب مزارع نے حصہ کم کرنے کی بات کی تو تم نے انکار کر دیا تھا۔''

اس کی مسکراہٹ میں حقارت تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک آ گئی۔ میں نے جونہی ان کے راز کی بات کھولی، اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ پھاٹک کے باہر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ مسٹر چاؤ اپنے کتے کے ساتھ اُن میں شامل تھے۔ وہ سب اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنے چہرے کپڑے کے نقابوں کے پیچھے چھپائے ہوئے تھے۔ اُن میں سے کچھ تو تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے مگر اُن کے لئے قہقہے چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سب ایک ہی گروہ میں شامل ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اُن کے سوچنے کا انداز مختلف ہے۔ اُن میں سے کچھ کا خیال تھا، چونکہ ایسے ہی ہوتا آیا ہے لہٰذا آدمی کو کھا

1-ایک ریکارڈ کے مطابق پی یا نے اپنے بیٹے کو ڈیوک ہوآن(Duke H uan) کے سامنے رکھا۔ ڈیوک نے 63-685 قبل مسیح تک حکومت کی۔ چی اور چاؤ اس سے پہلے حکمرانی کر چکے تھے۔ پاگل سے یہاں غلطی سرزد ہو گئی۔

2-چنگ خاندان کے آخری دور کا ایک انقلابی(1911-1644)۔ سوسی لن کو 1907 میں چنگ

افسر کے قتل کے جرم میں پھانسی دی گئی اور اسکا دل اور کلیجی کھائے گئے۔
جانا چاہئے۔بعض سوچتے کہ آدمی کو کھا جانا نامناسب ہے مگر وہ پھر بھی کھا جاتے تھے۔انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ اُن کا راز فاش نہ ہو جائے۔میری گفتگو پر برہمی کے باوجود وہ حقارت سے مسکراتے رہے۔

اچانک میرا بھائی غصے سے چیخا۔

''تم سب یہاں سے چلے جاؤ۔ایک پاگل کو دیکھنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟''

میں اُن کی مکاری سمجھ گیا۔وہ اپنی منصوبہ بندی میں کوئی تبدیلی نہیں لانا چاہتے تھے۔اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لئے انہوں نے مجھے پاگل مشہور کر دیا۔وہ جب مجھے کھائیں گے تو کسی قسم کا ردعمل نہیں ہوگا۔ہمارے مزارع نے دیہاتیوں کا ایک برے آدمی کو کھانے والا واقعہ سنایا تھا۔یہ لوگ بھی ایسا ہی کرنا چاہتے تھے۔یہ ان کا پرانا طریق کار ہے۔

بوڑھا چین غصے میں اندر آیا۔وہ میری زبان بند نہیں کر سکتے تھے۔میں نے کہا''تم لوگوں کو اپنے آپ کو تبدیل کرنا چاہئے۔تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ آنے والے وقت میں دنیا میں آدم خور نہیں رہ سکیں گے۔اگر تم نے خود کو تبدیل نہ کیا تو تم ایک دوسرے کو کھا جاؤ گے۔اگرچہ پیدا ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن طاقت ور کمزور کو ختم کر دیں گے۔جس طرح شکاریوں کے ہاتھوں بھیڑیئے مارے جا رہے ہیں.....رینگنے والے جانوروں کی طرح۔''

بوڑھے چین نے سب کو بھگا دیا۔میرا بھائی بھی چپکے سے کھسک گیا۔بوڑھے نے مجھے کمرے میں جانے کا مشورہ دیا۔کمرے میں گہری تاریکی تھی۔میرے داخل ہوتے بتیاں اور کڑیاں ہلنے لگیں۔تھوڑی دیر کے بعد ان کے حجم میں اضافہ ہو گیا اور پھر وہ میرے اوپر گر گئیں۔

ان کے وزن کے نیچے میں خود کو بے بس محسوس کیا۔میں جانتا تھا کہ یہ ان کی چال ہے اور میرے اوپر کا وزن مصنوعی ہے۔میں ہاتھ پاؤں مار کر نیچے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔میرا سانس پھولا ہوا تھا مگر میں نے اونچی آواز میں کہا۔

''تم لوگوں کو اپنے میں تبدیلی لانا چاہئے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مستقبل میں آدم خوروں کے لئے دنیا میں کوئی ٹھگانہ نہیں ہوگا۔''

(XI)

تاریک کمرے میں سورج کی روشنی نہیں آتی۔ دن میں دو دفعہ میرا کھانا پہنچا دیا جاتا ہے۔ میں نے کھانے کی تیلیاں (Chopsticks) اٹھائیں تو مجھے بڑے بھائی کا خیال آیا۔ میں جانتا ہوں کہ میری چھوٹی بہن اس کی وجہ سے مری۔ اس وقت وہ پانچ برس کی تھی۔ وہ بہت پیاری اور مظلوم لگ رہی تھی۔ ہماری ماں کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ بھائی شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا، غالباً وہ خود قاتل تھا۔ اگر اُس میں ذرا بھی غیرت ہوتی.....

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ماں حقیقت سے واقف تھی!

بعض اوقات مجھے گماں گزرتا ہے، ماں حقیقت سے واقف تھی۔ وہ کسی مصلحت کے تحت خاموش رہی۔ مجھے یاد آیا، اُس وقت میری عمر پانچ برس کے قریب تھی۔ ہم ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے بھائی نے مجھے بتایا، اگر والدین بیمار ہوں تو آدمی کو اپنا تھوڑا سا گوشت اُبال کر اُنہیں کھلانا چاہئے۔ ہماری ماں وہاں موجود تھی اور اُس نے تردید نہ کی۔ بہن کے ماتم کے دن یاد کر کے آج بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

(XII)

میرے اندر اس بات کو سوچنے کا حوصلہ نہیں۔

مجھے ابھی احساس ہوا ہے، جہاں میں رہ رہا ہوں وہاں پچھلے چار ہزار برسوں سے انسانی گوشت کھایا جا رہا ہے۔ جب ہماری بہن کی موت واقع ہوئی تھی اُس وقت بھائی نے گھر کا نظام سنبھالا ہی تھا۔ ممکن ہے اُس نے چاولوں اور دوسرے کھانوں میں بہن کا گوشت ڈالا ہو۔ ہم نے

غیر ارادی طور پر وہ کھا لیا۔

ممکن ہے میں نے غیر ارادی طور پر اپنی بہن کا گوشت کھایا اور اب میری باری ہے..... یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے جیسا آدمی جس کے پیچھے چار ہزار سال آدم خوری کی تاریخ ہو (شروع میں، میں اس بارے لاعلم تھا) ایک صحیح آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکے۔

(XIII)

غالباً ابھی کچھ ایسے بچے ہیں جنہوں نے آدمی کو نہیں کھایا۔ ان بچوں کو بچانا چاہئے.....

اپریل 1918ء

لوشون: Lu Hsun۔ (1881- 1936) نہ صرف عظیم مفکر اور سیاسی تجزیہ نگار تھے، وہ بہت بڑے ادیب اور افسانہ نگار بھی تھے۔ پاگل آدمی کی ڈائری مئی 1918 میں پہلی دفعہ شائع ہوئی۔ یہ جدید چینی ادب کا پہلا افسانہ تھا۔ اسے **'جاگیرداری کے خلاف اعلان جنگ'** کہا گیا۔ اس کے اکثر افسانے، جیسا کہ آہ کیو کی سچی کہانی، نئے سال کی قربانی وغیرہ قدیم اور تاریک معاشرے کی انسان دشمن اقدار کا پردہ چاک کرتی ہیں۔

اپنی شروع کی زندگی میں لوشون انقلابی جمہوریت پسند تھا لیکن بعد ازاں پورا کمیونسٹ ہو گیا۔ اس کی کہانیاں اپنے دور کی حقیقت کو عیاں کرتے ہوئے، سامراج اور جاگیرداری مخالف رویہ رکھے ہوئے ہیں، لیکن کہیں بھی وہ اپنے خیالات اپنی کہانیوں کے کرداروں پر تھوپتا نظر نہیں آتا۔ وہ ادب کو جدوجہد کا ہتھیار کہتا تھے اور اسی لئے ان کا ادب اپنے دور کے عام آدمی تک پہنچا اور اسے ذہنی، ثقافتی اور عقلی اعتبار سے اُس سطح تک لے گیا جہاں عام آدمی بھی معاشرے میں موجود غیر انسانی قدروں کو پہچان گیا اور پھر ان کے خلاف جدوجہد کے لئے تیار ہو گیا۔ یہ ہے **ادب کا حقیقت پسند نظریہ**، کہ ادب کی عام آدمی سے جڑت ہو اور وہ حقیقت کو جاننے کے بعد اس کو

تبدیل کرنے کی جدوجہد بھی کرے۔

چارہ

(1)

بظاہر کوئی سبب تو نظر نہ آتا تھا، مگر کوئی چھ مہینے سے بوڑھوں کا آرام گھر تک اپنا امن وسکون کھو چکا تھا۔ کچھ بوڑھے سرگوشیوں میں باتیں کرتے، جلدی جلدی اندر باہر آتے جاتے رہتے تھے۔ صرف پوای☆ ان دنیاوی جھمیلوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ خزاں کا موسم تھا اور ٹھنڈ بڑھتی جارہی تھی۔ یہ عمر کا تقاضا تھا کہ اسے سردی زیادہ لگتی تھی، لہٰذا وہ سارا دن دھوپ میں لیٹا رہتا اور کوئی عجلت میں قدم اٹھاتا ہوا بھی آتا تو وہ پلکیں اٹھا کر دیکھنے تک کی زحمت نہ کرتا۔

''بڑے بھیا!''

یہ شوچھی کی آواز تھی۔ پوای جو ہمیشہ آداب مجلس کا پابند رہا تھا، فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر سر اٹھا کر بھائی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

☆ پوای اور شوچھی کوچو کے بادشاہ کے بیٹے تھے۔ چو نے جب شانگ کو فتح کرلیا تو انہوں نے چو کا اناج کھانے سے انکار کردیا اور کوہ شویانگ پر فاقوں سے جان دے دی۔

''بڑے بھیا، یوں لگتا ہے سیاسی صورت حال اچھی نہیں۔'' شوچھی نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بھائی کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں لرزش پنہاں تھی۔

''بات کیا ہے؟'' پوای نے دیکھا کہ اس کے بھائی کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ زرد ہورہا تھا۔

''آپ نے دو نابینا موسیقاروں کے بارے میں تو سنا ہوگا جو شانگ کے بادشاہ کے ہاں سے فرار ہوکر آئے ہیں۔''

''ہاں'' شاید سان ای شنگ نے چند دن پہلے ان کا ذکر کیا تھا۔ مگر میں نے زیادہ دھیان نہ دیا تھا۔''

''میں نے آج ان سے ملاقات کی۔ایک گرینڈ ماسٹر چھی اور دوسرا جونیئر ماسٹر چھیا نگ ہے۔وہ اپنے ساتھ موسیقی کے کئی آلات لائے ہیں۔کچھ دن پہلے انہوں نے نمائش بھی لگائی اور جس کسی نے یہ آلات دیکھے عش عش کر اٹھا_ مگر مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ یہاں لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں۔''

''آلات موسیقی پر لڑائی؟ یہ بات ماضی کے شاہانہ اطوار سے ہم آہنگ نہیں۔''پوای نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''معاملہ صرف آلات موسیقی کا نہیں۔آپ شانگ کے بادشاہ کے ظلم وستم سے واقف ہی ہوں گے ۔ایک آدمی نے ٹھنڈے یخ پانی کی پروانہ کرتے ہوئے صبح سویرے ننگے پاؤں دریا پار کیا تو بادشاہ نے پاؤ ں کی ہڈیوں کا گودا دیکھنے کے لئے اس کے پاؤں کٹوا دئے تھے۔اس نے یہ دیکھنے کے لئے شہزادہ پی کان کا دل بھی نکال لیا کہ اس میں سات سوراخ تھے یا نہیں۔پہلے یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں،مگر موسیقاروں نے اب ان باتوں کی تصدیق کر دی ہے۔انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ شانگ کے بادشاہ نے بہت سے قدیم قوانین کی بے حرمتی کی ہے۔جو کوئی بھی قدیم قوانین کی بے حرمتی کرتا ہے اس پر حملہ واجب ہے۔ لیکن میری رائے میں رعیت کا راعی پر حملہ کرنا بھی ماضی کے شاہانہ اطوار کے منافی ہے...''

''روٹیاں دن بدن چھوٹی ہوتی جا رہی ہیں۔یہ ایک بری علامت ہے۔''پوای نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا،''مگر میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ باہر کم جایا کرو۔اور زبان کو لگام دو۔بس صبح سویرے مکے بازی کی مشق جاری رکھو۔''

''جی...''فرمانبردار چھوٹے بھائی شوچھی نے خاموشی سے سر تسلیم کر دیا۔

''ذرا اپنی حیثیت کا بھی خیال کرو۔''پوای جانتا تھا کہ وہ قائل نہیں ہوا،''ہم یہاں مہمان ہیں،کیونکہ مغرب کا بواب ☆بوڑھوں کی عزت کرتا ہے۔اگر روٹیاں چھوٹی بھی ہوتی جا رہی ہیں تو ہمیں شکایت کا حق نہیں پہنچتا_ بلکہ اس سے بدتر بھی کوئی بات ہو جائے تو بھی ہمیں شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔''

☆ چی چھا نگ،چو خاندان کا بادشاہ ون جو اس وقت تک شانگ کا حلقہ بگوش تھا۔

''بوڑھوں کے اس آرام گھر میں پناہ کی خاطر،کیا آپ یہیں پڑے رہیں گے؟''

''زیادہ باتیں مت کرو۔مجھ میں سننے کی سکت نہیں۔''

پوای نے کھانسنا شروع کر دیا اور شوچھی نے چپ سادھ لی۔

کھانسی کا دورہ رکا تو مکمل سکوت چھا گیا۔ اواخر خزاں کے ڈوبتے سورج کی کرنوں میں ان کی داڑھیاں برف کی مانند چمک رہی تھیں۔

(2)

ادھر بے چینی دن بدن بڑھتی گئی ۔ روٹیاں تو چھوٹی ہو ہی رہی تھیں، آٹا بھی موٹا آنے لگا تھا۔ بوڑھوں کے آرام گھر میں سرگوشیاں زور پکڑ گئیں ۔ باہر چھکڑوں اور گھوڑوں کی آمد و رفت کا شور سنائی دیتا رہتا تھا۔ شوچھی پر اب باہر جانے کی دھن کچھ زیادہ ہی سوار رہتی تھی۔ اور اگرچہ وہ واپس آ کر کچھ کہتا سنتا نہ تھا، مگر اس کا اضطراب دیکھ کر پوای کے لئے چپ رہنا دشوار ہو جاتا۔ اسے یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ جلد ہی وہ پیالہ بھر چاول سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

گیارہویں مہینے کے اواخر کی ایک صبح شوچھی حسب معمول اندھیرے منہ کسرت کے لئے اٹھا مگر صحن میں آتے ہی اس کے کان کھڑے ہو گئے اور پھاٹک کھول کر بعجلت باہر نکل گیا۔ کچھ اتنا ہی وقت بیتا ہو گا جتنا دس روٹیاں پکانے میں لگتا ہے کہ وہ ہانپتا کانپتا لوٹ آیا۔ ٹھنڈ سے اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی اور سانس بھاپ بن کر نکل رہی تھی۔

''بڑے بھیا، اٹھو!'' وہ چلایا، ''لڑائی شروع ہو چکی ہے!'' اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ ترش تھا۔ اندر آ کر وہ احتراماً باز و لٹکا کر پوای کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔

پوای کو سردی لگ رہی تھی، لہٰذا وہ اتنے سویرے بستر چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ مگر اپنی نرم دلی سے مجبور ہو کر اور بھائی کی پریشان حالی دیکھتے ہوئے دانت کٹکٹاتا اٹھ بیٹھا۔ اس نے کندھوں پر بھیڑ کی کھال کے استر والا چوغہ ڈالا اور رضائی کے اندر ہی آہستہ آہستہ کپڑے پہننے لگا۔

''میں کسرت کے لئے نکلا تھا کہ باہر گھوڑوں اور آدمیوں کا ملا جلا شور سنائی دیا۔'' شوچھی بتانے لگا، ''میں بھاگتا ہوا سڑک پر پہنچا تو وہاں وہ موجود تھے! پہلے ایک بڑی سی سفید پالکی آئی جس کے ساتھ کچھ نہیں تو اکتا سی کہار تھے ۔ پالکی میں ایک لوح تھی جس پر 'عظیم چو خاندان کے بادشاہ ون کے سائے کی سند' لکھا تھا۔ اس کے پیچھے سپاہیوں کا دستہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شانگ پر حملہ کرنے جا رہے ہیں ۔ چو کا موجودہ بادشاہ ایک سعادت مند بیٹا ہے۔ جنگ میں وہ بادشاہ ون کی لوح ساتھ لے کر جاتا ہے۔ میں زیادہ دیر تو وہاں نہیں رکا، لیکن جب لوٹ کر آیا تو ٹھیک ہماری دیوار پر ایک نوٹس چسپاں تھا...''

تب تک پوای کپڑے پہن چکا تھا۔ دونوں بھائی باہر نکلے تو سردی سے کپکپا اٹھے۔ پوای جو ہنگامہ پسند نہ تھا، باہر کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد شوچھی نے انگلی سے دیوار کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک بڑا سا نوٹس چسپاں تھا:

سرکاری فرمان

ہرگاہ کہ شانگ کے بادشاہ چاؤ نے اپنی بیوی کے کہنے میں آ کر آسمان سے ناتا توڑ لیا ہے، تین قسم کی عبادتیں ترک کر دی ہیں اور اپنے رشتہ داروں سے الگ تھلگ ہو گیا ہے۔

ہرگاہ کہ اس نے اپنی بیوی کی خوشنودی کے لئے اسلاف کی موسیقی متروک قرار دے دی ہے اور قدیم دھنوں کی بے حرمتی کرتے ہوئے بے ہودہ موسیقی تیار کروائی ہے۔

مابدولت، آسمان کی طرف سے ملنے والے اختیار کی رو سے، ہم اسے بجا طور پر سزا دینے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔

سپاہیو، میدان میں کود پڑو! فرمان ہذا کی دو تین بار اجرائی کا انتظار نہ کرو!

دونوں بھائی فرمان پڑھنے کے بعد خاموشی سے بڑی سڑک کی سمت چل دئے۔ سڑک کے دونوں طرف تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مگر وہ جونہی راستہ مانگتے، لوگ سفید ریش بوڑھوں کو دیکھ کر فوراً راستہ چھوڑ دیتے، کیونکہ بادشاہ ون نے ہدایت کر رکھی تھی کہ بوڑھوں کا احترام کیا جائے۔ چوبی لوح جو جلوس کے آگے آگے تھی، نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اب مسلح فوجی دستے گزر رہے تھے۔ اتنا وقت بیتا ہوگا۔ جتنا کہ تین سو باون روٹیاں پکانے میں لگتا ہے کہ مزید فوجی نمودار ہو گئے جن کے کندھوں پر نو کونوں والے جھنڈے رنگین بادلوں کی مانند لہرا رہے تھے۔ ان کے بعد اور مسلح دستے آئے۔ اور پھر عمدہ گھوڑوں پر سوار فوجی اور غیر فوجی افسروں کا انبوہ نمودار ہوا جو ایک شہزادے کی معیت میں چل رہے تھے۔ شہزادے کا رنگ گندمی اور چہرے پر مونچھیں تھیں۔ اس کے بائیں ہاتھ میں کانسی کا کلہاڑا تھا اور دائیں ہاتھ میں سفید گاؤدم جو جھنڈے کا کام دیتی تھی۔ اس کا پیکر دیکھنے والوں کو دم بخود کر کے رکھ دیتا تھا! وہ چوکا بادشاہ وو☆ تھا جو ''آسمان سے ملنے والے اختیار پر عمل کرنے'' جا رہا تھا۔

☆ بادشاہ ون کا بیٹا چی فا۔

راستے کے دونوں اطراف کھڑے لوگ اس کے رعب و دبدبے سے گویا سکتے میں آ گئے تھے۔

ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ اور اسی سکوت میں شوچھی اچانک پوای کو ساتھ کھینچتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔ کئی گھڑ سواروں کو جھکائی دے کر بادشاہ کے گھوڑے کی لگام تھامی اور گردن نکال کر چلا اٹھا:

''تمہارا باپ ابھی ابھی مرا ہے۔ اس کا کفن دفن کرنے کی بجائے تم جنگ لڑنے چلے آئے ہو۔ کیا اسی کو سعادت مندی کہتے ہیں؟ رعایا ہو کر تم اپنے راعی کو قتل کرنے نکلے ہو_ کیا اخلاق اسی کو کہتے ہیں؟''

سڑک کے دونوں کناروں پر کھڑے ہجوم اور مسلح محافظ کی رگوں میں دشت کے مارے لمحہ بھر کے لئے تو خون جم رہ گیا۔ چو کے بادشاہ کے ہاتھ میں گاؤدم جھنڈا ذرا سا جھک گیا، اور پھر ایک ہلچل مچ گئی۔ دونوں بھائیوں کے سروں پر لمبی تلواریں لہرانے لگیں۔

''ٹھہرو!''

کسی کو حکم عدولی کی جرأت نہ ہوئی کہ یہ سردار چیانگ شانگ☆ کا حکم تھا۔ ہاتھ جہاں تھے وہیں ساکت ہو گئے اور نظریں اس کے بھرے بھرے گول چہرے پر جم گئیں۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال بھی سفید تھے۔

''یہ ایماندار آدمی ہیں۔ انہیں جانے دو!''

☆ چو کے بادشاہ وو کا مشیر۔

افسروں نے فوراً اپنی تلواریں نیام میں ڈال لیں۔ چار مسلح سپاہی آگے بڑھے، تن کر بڑے احترام سے پوای اور شوچھی کو سلام کیا۔ اور پھر دو دو سپاہی انہیں بازوؤں سے پکڑ کر سڑک کے کنارے لے گئے۔ ہجوم نے فوراً ان کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

ہجوم کے عقب میں پہنچنے کے بعد سپاہی پھر احتراماً تن کر کھڑے ہو گئے اور دونوں بوڑھوں کے بازوں چھوڑ کر زور سے دھکا دے دیا۔ دونوں کی چیخیں نکل گئیں اور لڑکھڑاتے ہوئے زمین پر جا گرے۔ شوچھی نے خوش قسمتی سے ہاتھ زمین پر ٹکا دئے تھے، اس لئے اس کا صرف چہرہ ہی کیچڑ میں لت پت ہوا۔ مگر پوای کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ آخر وہ تھا بھی تو زیادہ بوڑھا!

(3)

فوج نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ہجوم نے مڑ کر پوای اور شوچھی کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ ان میں سے

ایک زمین پر چت پڑا تھا اور دوسرا بیٹھا ہوا تھا۔ چند ایک لوگ جو انہیں جانتے تھے، دوسروں کو بتانے لگے کہ وہ لیاؤشی میں کوچو کے بادشاہ کے بیٹے ہیں، اور تخت و تاج سے دستبرداری کا اعلان کر کے اب بوڑھوں کے آرام گھر میں رہتے ہیں جو آنجہانی بادشاہ نے قائم کیا تھا۔ یہ سن کر لوگ زیرلب ان کی تعریفیں کرنے لگے۔ کچھ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور شوچھی کا منہ دیکھنے لگے۔ کچھ ادرک کا شوربا بنانے گھر چلے گئے اور کچھ لوگوں نے جا کر بوڑھوں کے آرام گھر والوں کو مطلع کر دیا اور کہا کہ؛ وہ فوراً دروازے کا تختہ بھیج دیں تا کہ اس سے اسٹریچر بنا لیا جائے۔

اتنا وقت بیت گیا جس میں کہ ایک سو تین یا ایک سو چار بڑی روٹیاں پک سکتی تھیں۔ اس دوران چونکہ کوئی نئی بات دیکھنے میں نہ آئی، لہذا لوگ ایک ایک کر کے کھسک گئے۔ آخر کار دو بوڑھے دروازے کا تختہ جس پر پیال بچھی ہوئی تھی، لیکر لڑکھڑاتے ڈگمگاتے آ پہنچے۔ یہ روایت بادشاہ ون نے بوڑھوں کے احترام کے لئے قائم کی تھی۔ انہوں نے دروازے کا پٹ اتنے زور سے زمین پر پٹخا کہ پوای نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ہنوز زندگی کی رمق تھی! شوچھی حیرت اور خوشی سے چیخ اٹھا، اور بوڑھوں کی مدد سے بھائی کو آرام سے اس اسٹریچر پر لٹا دیا۔ اور پھر دروازے کے تختے کو جوڑنے والی سن کی رسی تھامے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ کوئی ساٹھ ستر قدم چلے ہوں گے کہ پیچھے سے کسی نے پکار کر کہا:

''ٹھہر جاؤ! میں ادرک کا شوربا لاتی ہوں!'' ایک نوجوان میٹرن ہاتھوں میں مٹی کا پیالہ اٹھائے تیز تیز قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ وہ اس خدشے سے دوڑ نہیں رہی تھی کہ مبادا شوربا چھلک جائے۔

وہ اس کے انتظار میں رک گئے اور شوچھی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ میٹرن پوای کو ہوش میں دیکھ کر کچھ بجھ سی گئی تھی، تاہم اس کے پیٹ پر مالش کرتے ہوئے اصرار کرنے لگی کہ وہ ادرک کا شوربا پی لے ۔مگر پوای نے جو گرم چیزوں سے پرہیز کرتا تھا، انکار کر دیا۔

''کیا کروں؟ یہ ادرک میں نے آٹھ سال سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ کوئی تمہیں اس سے بہتر چیز نہیں دے سکتا۔ اور میرے گھر میں بھی کوئی ادرک پسند نہیں کرتا...'' وہ بالکل گڑبڑا گئی تھی۔

شوچھی نے پیالہ لے لیا اور پوای کو ایک دو گھونٹ لینے پر مجبور کر دیا۔ پھر بھی کافی شوربا بچ رہا تھا، چنانچہ پیٹ میں درد کے بہانے وہ خود سارا شوربا پی گیا۔ اس کی پلکیں لال انگارہ ہو گئیں۔ تاہم

اس نے ادرک کی تاثیر کی خوب خوب تعریفیں کیں اور ایک بار پھر عورت کا شکریہ ادا کیا۔ یوں پوای کو اس آفت سے جات دلا دی۔

بوڑھوں کے آرام گھر میں واپسی کے بعد ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ تیسرے روز پوای چلنے پھر نے لگا۔ گو اس کی پیشانی پر ابھی تک ایک بڑا سا گومڑا ابھرا ہوا تھا ار بھوک مر چکی تھی۔

حکام اور عام لوگ انہیں تنہا نہیں چھوٹے تھے۔ مزید برآں، سرکاری اعلانات اور افواہیں مسلسل آرہی تھیں جنہیں سن کر ان کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی تھی۔ بارہویں مہینے کے اواخر میں خبر آئی کہ فوج نے منگ کے مقام پر دریا پار کیا اور تمام جاگیردار شہزادے اس سے مل گئے۔ زیادہ دن نہ بیتے تھے کہ بادشاہ وو کے ''عظیم اعلان'' کی ایک نقل آ گئی۔ یہ بوڑھوں ضعف نظر کے خیال سے خاص طور پر اخروٹ ایسے بڑے بڑے حروف میں لکھی گئی تھی۔ پوای نے اعلان خود پڑھنے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ جو کچھ بھائی نے سنایا، سن لیا۔ اسے اس میں کوئی بڑی قابل اعتراض بات نظر نہ آئی، تاہم بعض بے موقع اصطلاحات، مثلاً اس نے مناسب رسوم ادا نہ کیں اور اسلاف سے قطع تعلق کر لیا، اپنے وطن کو شیطانی انداز میں فراموش کر دیا...'' سن کر اس کا دل خون کے آنسو رو دیا۔

اور پھر افواہیں بڑھنے لگیں۔ کسی نے کہا کہ جب چوکی فوج مو یہہ پہنچی تو شانگ کی فوج سے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ میدان جنگ میں کشتوں کے پشتے لگ گئے اور لاٹھیاں خون کے دریا میں گھاس کے تنکوں کی مانند بہنے لگیں۔ کسی نے یہ اڑائی کہ شانگ کے بادشاہ کے پاس سات لاکھ سپاہی تھی، مگر انہوں نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ جب سردار چیانگ شانگ کی قیادت میں چوکی ف وج پہنچی تو وہ دم دبا کر بھاگ نکلے اور بادشاہ وو کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

ان داستانوں میں اختلافات کے باوجود ایک بات صاف تھی کہ فتح حاصل کی جا چکی تھی۔ اس صداقت کی تصدیق بعد ازاں اس خبر سے ہوگئی کہ بارہ سنگھالاٹ کے خزانے اور عظیم پل ☆ کے سفید چاول ریاست چو میں لائے جا رہے تھے۔ زخمی سپاہی بھی واپس آ رہے تھے جو اس بات کا ثبوت تھا کہ گھمسان کا رن پڑا ہوگا۔ وہ تمام سپاہی جو چلنے پھرنے کے قابل تھے، چائے خانوں، سراؤں اور حجاموں کی دکانوں یا پھر مکانوں کے بیرونی چھجوں تلے یا کسی مکان کے پھاٹک کے سامنے بیٹھ کر لڑائی کی کہانیاں سناتے رہتے تھے۔ اور ان کے گرد مشتاق سامعین کا ہجوم رہتا تھا۔ بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا اور کھلے میں

زیادہ خنکی نہ تھی، چنانچہ بسا اوقات یہ داستان گوئی رات گئے تک جاری رہتی تھی۔

پوای اور شوچھی دونوں بدہضمی کا شکار تھے، اور اپنے حصے کی روٹیاں ختم نہیں کر پاتے تھے۔ ان کی سونے کی عادت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اور رات ہوتے ہی باقاعدگی کے ساتھ بستر پر دراز ہو جاتے تھے، مگر اب واہ بے خوابی کے مرض میں بھی مبتلا ہو چکے تھے۔ پوای بستر میں کروٹیں بدلتا رہتا، تا آنکہ شوچھی بے چین اور ملول سا ہو کر اٹھ بیٹھتا اور کپڑے بدل کر صحن میں ٹہلنے نکل جاتا یا کسرت شروع کر دیتا۔

ایک بے چاند رات آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ دوسرے بوڑھے چین کی نیند سو رہے تھے، مگر پھاٹک پر

☆ بارہ سنگھالاٹ اور عظیم پل شانگ کے بادشاہ چاؤ کے دو گودام تھے۔ اولالذکر میں جواہرت اور موخرالذکر میں اناج کا ذخیرہ ہوتا تھا۔

ہنوز باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شوچھی نے زندگی میں کبھی چھپ کر کسی کی بات سننے کی کوشش نہ کی تھی، مگر اس رات وہ بھی ٹہلتے ٹہلتے رک کر سننے لگا۔

''شانگ کا وہ لعنتی بادشاہ! شکست کھاتے ہی بارہ سنگھالاٹ میں جا گھسا۔'' بولنے والا یقیناً کوئی زخمی سپاہی تھا جو محاذ سے لوٹا تھا۔ ''اس کا خانہ خراب! اس نے بیش بہا نوادر کا ڈھیر لگا، خود بیچوں بیچ بیٹھا اور ڈھیر کو آگ لگا دی۔''

''نہیں تو! یہ تو بہت بڑا ہوا!'' چوکیدار نے تبصرہ کیا۔

''گھبراؤ نہیں! وہ تو بھسم ہو گیا مگر خزانہ بچ گیا۔ ہمارا بادشاہ تمام شہزادوں کے جلو میں شانگ کے دارالحکومت میں داخل ہوا تو شہریوں نے مضافات میں آ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ ہمارے بادشاہ نے اہلکاروں کو اس منادی کا حکم دیا: 'ہمیں تو لوگوں سے کوئی پرخاش نہیں!' اور شانگ کے شہری سجدے میں گر گئے۔ شہر میں ہر دروازے پر بڑے بڑے الفاظ میں 'مطیع عوام' لکھا تھا۔ ہمارا بادشاہ اپنا رتھ دوڑاتا ہوا دسیدھا بارہ سنگھالاٹ میں پہنچا، اور جب اس نے وہ جگہ دیکھی جہاں شانگ کے بادشاہ نے خودکشی کی تھی، تو اس پر تین تیر چلا دئے...''

''کیوں؟ اس خیال سے کہ ابھی وہ مرا نہیں تھا؟'' کسی نے پوچھا۔

''کون جانے؟ بہرحال اس نے تین تیر چلائے، اس کے جسم میں تلوار گھونپی کانسی کے کلہاڑے

سے بھٹاسی گردن اڑائی اور پھر کٹی ہوئی وہ گردن ایک بہت بڑے سفید جھنڈے سے لٹکا دی۔''

شوچھی کی رگوں میں رگوں میں سرد لہر دوڑ گئی۔

''اس کے بعد وہ شانگ کے بادشاہ کی دو داشتاؤں کی تلاش میں نکلا۔ مگر وہ پہلے ہی خودکشی کر چکی تھیں۔ ہمارے بادشاہ نے تین تیر اور چلائے، ان کے جسموں میں تلوار گھونپی اور کالے کلہاڑے سے ان کے سر کاٹ کر چھوٹے سفید جھنڈے سے لٹکا دئے۔ پس...''

''کیا وہ دونوں داشتائیں واقعی حسین تھیں؟'' چوکیدار نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھ لیا۔

''پتہ نہیں! جھنڈے کا بانس بہت لمبا تھا اور ہجوم بھی اتنا کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میرا زخم تکلیف دے رہا تھا اس لئے میں قریب نہ جا سکا۔''

''لوگ کہتے ہیں کہ ایک داشتہ جس کا نام تاچھی تھا، دراصل لومڑی تھی۔ وہ سارا جسم تبدیل کر لیتی تھی، سوائے پچھلے پنجوں کے جنہیں وہ پٹیوں میں چھپا کر رکھتی تھی۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''پتہ نہیں! میں نے اس کے پاؤں نہیں دیکھے۔ مگر ان علاقوں میں بہت سی عورتیں پاؤں باندھ کر رکھتی ہیں۔''

شوچھی اخلاقی اصولوں کا پابند تھا۔ جب بات بادشاہ کے سر سے ہوتے ہوتے عورتوں کے پاؤں تک پہنچ گئی تو اس نے تیوری چڑھا کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور لپک کر کمرے میں آ گیا۔ پوای نے جو ابھی تک جاگ رہا تھا، دھیمے لہجے میں پوچھا:

''کسرت کر رہے تھے کیا؟''

شوچھی کوئی جواب دینے کی بجائے ہولے ہولے قدماٹھا تا بھائی کے پلنگ کی پٹی پر جا بیٹھا اور جھک کر سب کچھ بتا دیا جو ابھی ابھی سن کر آیا تھا۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہے اور پھر شوچھی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سرگوشی کی:

''ذرا سوچو تو وہ بادشاہ ون کے اصولوں کی کیا گت بنا رہا ہے!... وہ پسرانہ سعادت مندی ہی سے نہیں انسانیت سے بھی عاری ہے!... یہ سب کچھ دیکھنے سننے کے بعد تو اس کی دی ہوئی روٹی حلق سے اتارے نہ اترے گی۔''

''تو پھر کیا کریں؟''

''میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیئے ...''

کچھ دیر سوچ بچار کے بعد انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ چوخاندان کی روٹی اب نہیں کھائیں گے اور صبح ہوتے ہی بوڑھوں کے آرام گھر سے نکل جائیں گے۔ کوئی زادراہ ساتھ نہیں لیں گے اور زندگی کے باقی ماندہ دن کوہ ہوا شان پر بیر اور پتے کھا کر بتا دیں گے۔ مزید برآں، ''آسمان غیر جانبدار تو ہے، مگر اکثر بھلائی کا ساتھ دیتا ہے۔'' ممکن ہے وہاں انہیں کچھ برتھ وورٹ یا ٹرفلز☆ نام کی جڑی بوٹیاں بھی مل جائیں۔

☆ دو چینی جڑی بوٹیاں۔ خیال ہے کہ ان کے استعمال سے عمر بڑھتی ہے

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد ان کے ذہنوں سے گویا بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ شوچھی کپڑے بدل کر پھر بستر پر دراز ہوگیا۔ اسے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ سوتے میں پوای کی باتیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے دل میں خوشیاں ناچ اٹھی تھیں۔ نادیدہ جڑی بوٹیوں کی خوشبو اس کے نتھنوں میں سمائی جارہی تھی۔ اور اسی خوشبو میں ڈوبا وہ نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

(4)

صبح دونوں بھائی معمول سے پہلے ہی بیدار ہوگئے۔ انہوں نے بال دھو کر کنگھی کی اور کوئی چیز ساتھ لئے بغیر_ ان کے پاس بھیڑ کی کھال کے استر والے چوغوں، چھڑیوں اور بچی کھچی روٹیوں کے سوا ساتھ لے جانے کو کچھ تھا ہی نہیں_ بوڑھوں کے آرام گھر سے یوں نکل گئے گویا ٹہلنے جارہے ہوں۔ تاہم اس خیال سے کہ وہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے رخصت ہورہے تھے، ان کے رگ و پے میں ایک خفیف سی سرسراہٹ ہورہی تھی۔ چلتے چلتے کئی بار انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

راہ گیر اکا دکا ہی تھے۔ وہ چند عورتوں کے قریب سے گزرے جن کے پپوٹے ہنوز سے بوجھل تھے، اور وہ کنویں سے پانی کھینچ رہی تھیں۔ مضافات میں پہنچتے پہنچتے سورج خاصا بلند ہو چکا تھا اور سڑکوں پر آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ بیشتر راہ گیر بڑے فخر سے سر اٹھائے چل رہے تھے، تاہم رواج کے مطابق ان بوڑھوں کو دیکھتے ہی راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ وہ دیہی علاقے میں آپہنچے جہاں سے جنگل شروع ہوتے تھے۔ بہت سے درختوں پر جن کے نام بھی انہیں معلوم نہ تھے، پتے پھوٹنے لگے تھے۔ ایک زمردیں غبار نے سرو و صنوبر کے درختوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

اس آزاد اور پرفضا کے خطے میں سانس لیتے ہوئے پوای اور شوچھی کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کی جوانی عود کر آئی ہو۔ چلتے چلتے راہ میں ایک چشمہ آ گیا اور ان کے دل خوشی سے اچھل اٹھے۔

اگلے روز سہ پہر میں وہ ایک دوراہے پر پہنچے تو مخمصے میں پڑ گئے۔ انہوں نے بڑی خوش خلقی کے ساتھ سامنے سے آتے ہوئے ایک بوڑھے سے راستہ پوچھا تو وہ کہنے لگا:

''افسوس، آپ لوگ ذرا پہلے آتے تو گھوڑوں کے ایک گلے کے پیچھے پیچھے چلے جاتے جو ابھی ابھی ادھر سے گزرا ہے۔ خیر، یہ ہے راستہ۔ آگے اور بھی دوراہے آئیں گے اور آپ کو پھر پوچھنا پڑے گا۔''

شوچی کو یاد آیا کہ دوپہر میں کچھ زخمی سپاہی ان کے قریب سے گزرے تھے جو متعدد بوڑھے، کمزور، لنگڑے اور خارش زدہ گھوڑوں کو ہانک رہے تھے۔ اور ان گھوڑوں نے تو دونوں کو قریب قریب کچل ہی دیا تھا۔ انہوں نے بوڑھے سے پوچھا کہ گھوڑے کہاں لے جائے جا رہے تھے تو اس نے جواب دیا:

''آپ لوگوں کو نہیں معلوم؟ اب جب کہ ہمارے بادشاہ نے آسمانی فرض پورا کر دیا ہے تو اسے مزید فوجوں کی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ وہ گھوڑوں کو کوہ ہواشان کی جنوبی ڈھلانوں پر بھیج رہا ہے، جب کہ ہم اپنی بھیڑ بکریاں 'آڑو کا باغ، میدان میں چرائیں گے۔ اب ساری دنیا امن چین سے روٹی کھائے گی!''

یہ خبر دونوں بھائیوں پر بجلی بن کر گری۔ ان کے قدم ڈگمگا گئے، تاہم انہوں نے چہروں سے کوئی تاثر عیاں نہ ہونے دیا۔ بوڑھے کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے۔ کوہ ہواشان پر گھوڑوں کے چرنے کی خبر نے ان کے خواب پریشان کر دئے تھے اور ان کے دلوں وسوسے سر اٹھانے لگے تھے۔

گو ان کے دلوں میں وسوسے پیدا ہو چکے تھے مگر وہ خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ شام ہوتے ہوتے وہ درختوں سے ڈھکی ایک زرد مٹی کی پہاڑی کے قریب جا پہنچے جہاں چند کچے گھروندے دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

وہ پہاڑی سے ابھی کوئی دس قدم دور تھے کہ پانچ تنومند شخص درختوں سے نکل آئے۔ ان کے سروں پر سفید پگڑیاں اور جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ سب سے آگے والے شخص کے ہاتھ میں تلوار

اور دوسروں کے پاس لاٹھیاں تھیں۔انہوں نے دونوں بوڑھوں کا راستہ روکتے ہوئے احتراماً جھک کر چیختے ہوئے کہا:

''معزز حضرات، کہئے مزاج کیسے ہیں؟''

دونوں بھائی خوف کے مارے سمٹ سے گئے۔ پوای تھر تھر کانپنے لگا۔تاہم شوچھی نے جو زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا تھا، آگے بڑھ کر پوچھا کہ وہ کون تھے اور کیا چاہتے تھے۔

''میں چھوٹا چھیونگ چھی ہوں، کوہ ہوا شان کا سردار۔'' تلوار والے نے جواب دیا،'' آپ سے معمولی راہداری وصول کرنے کے لئے نیں اپنے آدمیوں کو ساتھ لایا ہوں۔''

''ہمارے پاس کوئی پیسہ ویسہ نہیں ہے، سردار۔'' شوچھی نے شائستگی سے جواب دیا،''ہم بوڑھوں کے آرام گھر سے آرہے ہیں۔''

''آہا!'' چھیونگ چھی نے فوراً مودب لہجے میں چیخ کر کہا،''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ یقیناً سلطنت کے دوقابل احترام بزرگ ہیں۔ ہم ابھی آنجہانی بادشاہ کی تعلیمات کا پاس کرتے ہوئے بوڑھوں کے ساتھ بے حد احترام سے پیش آتے ہیں ۔ ہماری درخواست ہے کہ آپ اپنی کوئی نشانی ہمارے پاس چھوڑ جائیں۔'' شوچھی نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے تلوار لہراتے ہوئے پھر چلا کر کہا،''اگر آپ انکار کرتے رہے تو ہم رضائے آسمانی کے مطابق آپ کی باادب تلاشی لینے اور آپ کی قابل احترام عریانی پر مودب نگاہیں ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

پوای اور شوچھی نے فوراً ہاتھ اٹھالئے۔ایک لاٹھی بردار نے اچھی طرح تلاشی لینے کے لئے ان کے چوغے، روئی دار مرزئیاں اور قمیصیں اتار دیں۔

''یہ سچ کہہ رہے ہیں۔ان دونوں کنگالوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔''اس نے مڑ کر مایوس لہجے میں چھیونگ چھی کو مطلع کیا۔

چھیونگ چھی یہ دیکھتے ہوئے کہ پوای کانپ رہا تھا، آگے بڑھ کر بڑی شائستگی کے ساتھ اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں جناب۔''اس نے چیخ کر کہا،''شنگھائی والے ہوتے تو آپ کو ننگا کر کے بھیجتے۔لیکن ہم اتنے مہذب ہیں کہ اس قسم کی حرکت نہیں کرتے۔آپ کے پاس دینے کو کوئی نشانی

نہیں تو یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ جناب، اب آپ یہاں سے جا سکتے ہیں!''

دم بخود پوای کو، پورے کپڑے پہننے کا بھی یارا نہ ہوا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ شوچھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ان کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ پانچوں راہزن ادب سے بازو لٹکائے کھڑے رہے۔

''آپ لوگ واقعی جا رہے ہیں؟ چائے تو پیتے جائیں؟'' انہوں نے پکار کر کہا۔

''نہیں، شکریہ۔ پھر کبھی سہی...'' پوای اور شوچھی نے بھاگتے بھاگتے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔

(5)

کوہ ہواشان کی جنوبی ڈھلانوں پر گھوڑے بھیجنے کی خبر اور پہاڑ کے سردار چھیونگ چھی کی موجودگی نے ان دونوں ایماندار بوڑھوں کو سہا دیا اور انہوں نے کچھ مزید سوچ بچار کے بعد اس خطے میں داخل ہونے کی بجائے شمال کا رخ کر لیا۔ وہ پو پھٹے چلنا شروع کرتے ڈھلے آرام کے لئے رکتے۔ اور یوں مسافتیں طے کرتے ہوئے وہ کوہ شویانگ پر پہنچ گئے۔

یہ جگہ ان کے لئے بڑی موزوں ثابت ہوئی۔ پہاڑ نہ تو زیادہ اونچا تھا اور نہ ہی بہت وسیع۔ یہاں گھنے جنگل بھی کم تھے جن میں شیروں، بھیڑیوں یا ڈاکوؤں کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ گوشہ نشینی کے لئے اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہ ہو سکتی تھی۔ انہوں نے آس پاس کے منظر کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں نرم نرم دوب اور مٹی سنہری تھی۔ اور گھاس میں یہاں وہاں سرخ و سفید پھول جھوم رہے تھے۔ یہ نظارہ ہی قلب و نظر کی سرمستی کے لئے کافی تھا۔ دونوں خوشی سے سرشار، چھڑیاں ٹیکتے بالآخر چوٹی پر ایک آگے کو نکلی ہوئی چٹان تلے پہنچ گئے۔ یہ ان کی پناہ گاہ تھی۔ وہ پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے ہوئے بیٹھ کر سستانے لگے۔

سورج ڈوب رہا تھا اور پرندے چہچہاتے ہوئے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ پہاڑ پر چڑھتے وقت جو سکوت طاری تھا، اس میں اب قدرے کمی آ چکی تھی، تاہم گردوپیش کے حسن نے ان کے دل موہ لئے تھے۔ سونے کے لئے بھیڑ کی کھال کے استر اوالے چوغے بچھانے سے قبل شوچھی نے چاولوں کے دو بڑے مرنڈے نکالے جن سے انہوں نے پیٹ کی آگ بجھائی۔ راستے میں انہوں نے جو بھیک مانگی تھی، اس میں سے صرف یہ دو مرنڈے باقی بچے تھے۔ راہ میں دونوں بھائیوں نے اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ کوہ شوہ یانگ پر پہنچنے کے لئے اگر انہوں نے بھیک نہ مانگی تو ''چوکا اناج نہ کھانے'' کا عہد پورا نہ

کرسکیں گے۔انہوں نے یہ مرنڈے کھالئے تھے۔اور یہ طے تھا کہ اگلے دن سے وہ اپنے اصولوں کے پابند رہیں گے اور کوئی سودے بازی نہ کریں گے۔

علی الصباح کوؤں کی کائیں کائیں سے ان کی آنکھ کھل گئی۔تھوڑی دیر میں وہ پھر سو گئے اور جب جاگے تو دوپہر ہو رہی تھی۔پوای کی ٹانگیں اور کمر اس قدر دکھ رہے تھے کہ اس سے اٹھا نہ گیا، چنانچہ شوچھی تنہا ہی خوراک کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔مگر کچھ دیر ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد اسے احساس ہو گیا کہ اس نہ زیادہ اونچے نہ زیادہ وسیع اور شیروں، بھیڑیوں اور راہ زنوں سے پاک پہاڑ پر رہنے کے فوائد ہی نہیں، کچھ گھاٹے بھی تھے۔اس پہاڑ کے دامن میں آباد گاؤں کے لوگ ایندھن کاٹنے اور آتے رہتے تھے، اور ان کے ہمراہ چونکہ بچے بھی ہوتے تھے، لہذا کہیں بیروں کا نشان تک نہ تھا_ وہ سب توڑ لئے گئے تھے۔

اسے ٹرفلز کا خیال آیا، اور گو پہاڑ پر سرو کے درخت تھے، مگر اتنے بوڑھے نہ تھے کہ ان کی جڑوں میں یہ بوٹی ہوتی۔اور ہوتی بھی تو کدال کے بغیر نکالنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔پھر اس نے برتھ وورٹ کے بارے میں سوچا۔لیکن اس کی صرف جڑیں ہی اس نے دیکھ رکھی تھیں۔پتے کیسے ہوتے تھے یہ وہ نہ جانتا تھا۔اور سارے پہاڑ پر ایک ایک پودے کو اکھاڑ کر جڑوں کا معائنہ کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔اگر وہ اس کی آنکھوں کے عین سامنے بھی اگی ہوتی تو بھی اسے پہچان نہ سکتا تھا۔اسے غصہ آ گیا، رخسار تپنے لگے اور وہ مایوسی کے عالم میں کھڑا سر کھجاتا رہا۔

دفعتاً ایک ترکیب اس کے ذہن میں ابھری اور وہ پرسکون ہو گیا۔اس نے صنوبر کے درخت سے سخت نوکیلے پتے توڑے، ندی پر جا کر دو پتھر لئے اور ان سے کچل کر چھال الگ کی، دھو کر لپٹا سا بنایا اور سلیٹ پر رکھ کر اپنی پناہ گاہ میں لے آیا۔

پوای نے اسے دیکھتے ہی پوچھا:

''بھائی کھانے کو کچھ ملا؟ میرے پیٹ میں تو چوہے کود رہے ہیں۔''

''بڑے بھائی اور تو کچھ نہیں ملا۔یہ آزما کر دیکھتے ہیں۔''

اس نے سلیٹ دو پتھروں پر رکھی اور خشک شاخیں نیچے رکھ کر آگے جلا دی۔ایک طویل انتظار کے بعد اس لپٹے میں بلبلے اٹھنے لگے اور خوشبو سے ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔شوچھی کے چہرے پر ایک

اطمیناں بھری مسکراہٹ کھیلنے لگی۔اس نے یہ ترکیب اس ضیافت میں سیکھی تھی جو بزرگ چیانگ شانگ کی پچاس ویں سالگرہ پر دی گئی تھی۔

مہک چھوڑنے کے بعد لپٹے میں ابال آیا اور جوں جوں پانی خشک ہوتا گیا، مقدار گھٹتی گئی اور آخر وہ کیک جیسی شکل اختیار کر گیا۔شوچھی نے چوغے کی آستین ہاتھوں میں دبا کر سلیٹ اٹھائی کے پاس لے گیا۔پوای نے پھونکیں مارتے ہوئے ایک ٹکڑا توڑا اور منہ میں رکھ لیا۔

مگر جیسے جیسے وہ چباتا گیا، پیشانی کی شکنیں دونی ہوتی گئیں۔اس نے کئی بار زور لگا کر اسے نگلنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا اور آخر برا سا منہ کر بنا کر لقمہ تھوکتے ہوئے ملامت آمیز نظروں سے بھائی دیکھتے ہوئے بولا:

''کڑوا ہے.....بہت سخت ہے...''

شوچھی شرم سے پانی ہوگیا۔اس کی ساری امیدیں جاتی رہیں۔کانپتی انگلیوں سے اس نے بھی ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور چبانے لگا۔وہ واقعی کھانے کے لائق نہ تھا۔کڑوا...بہت سخت ہے....''

شوچھی نے نیم دلی کے ساتھ سر جھکا لیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرے؟ خیالوں میں گم وہ اپنے بچپن کی وادیوں میں جا نکلا، کوچو کے بادشاہ کا بیٹا۔ایک دیہاتی آیا اسے گود میں لئے پھرتی اور طرح طرح کی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔چھی یو پرز رد شہنشاہ کی فتح کی کہانی، ووچی چھی پر عظیم یوی کی فتح کی کہانی، قحط کی کہانی جس میں کسان چارہ کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اس نے آیا سے پوچھا تھا کہ چارہ کیسا ہوتا ہے اور اب اسے یاد آیا پہاڑ پر وہ ویسے ہی پودے دیکھ چکا تھا۔اس کے حوصلے پلٹ آئے۔وہ اٹھا اور باہر جا کر پودوں میں اس نے خود چارہ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔اور واقعی پہاڑ پر اس چارے کی کمی نہ تھی۔کوئی آدھے میل کے چکر میں اس کے دامن چارے سے پھر چکا تھا۔

اس نے ندی پر جا کر پتے دھوئے اور پھر پناہ گاہ میں لا کر اسی سلیٹ پر بھوننے لگا جس پر اس نے صنوبر کے پتوں کا لپٹا پکایا تھا۔پتوں کا رنگ گہرا سبز ہونے پر اسے اندازہ ہوگیا کہ اب وہ پک چکے ہوں گے۔بہرحال اس بار اس نے یہ کھانا پہلے بھائی کو پیش کرنے کی جرأت نہ کی۔اس نے ایک لقمہ لیا اور پلکیں موند کر چبانے لگا۔

''کیسا ہے ذائقہ؟'' پوای نے بے تابی سے پوچھا۔

''بہت مزیدار!''

دونوں ہنستے ہوئے چارہ کھانے لگے۔ پوای نے بڑے بھائی ہونے کے ناتے دو لقمے زیادہ لئے۔

اب یہ ان کا روز کا معمول بن گیا۔ ابتدا میں شوچھی اکیلا ہی چارہ چننے جاتا تھا جب کہ پوای نے پکانے کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی۔ اور پھر جب اس کی قوت بحال ہوگئی۔ تو وہ بھی چارے کی تلاش میں شامل ہوگیا۔ اب وہ چارے سے طرح طرح کے پکوان تیار کرنے لگے:

چارے کا شوربا، چارے کی یخنی، چارے کی پوریاں، ابلا ہوا چارہ دم پخت چارہ، خشک چارہ...

دھیرے دھیرے آس پاس سارا چارہ ختم ہوگیا۔ انہوں نے گوجڑیں چھوڑ دی تھیں، لیکن نئے پتے پھوٹنے میں بھی وقت لگتا تھا۔ وہ چارے کی تلاش میں دور نکلتے چلے گئے اور اسی وجہ سے انہیں کئی بار رہائش بدلنی پڑی۔ ہوتے ہوتے رہائش کے لئے مناسب جگہیں عنقا ہوگئیں، کیونکہ رہائش کے لئے پہلی شرط یہی تھی کہ قرب وجوار میں وافر چارہ اور پانی موجود ہو۔ اور کوہ شویانگ پر ایسی جگہیں زیادہ نہ تھیں جہاں یہ دونوں سہولتیں بیک وقت موجود ہوں۔ شوچھی اس ڈر سے کہ پوای بڑھاپے کی وجہ سے کہیں بیمار نہ پڑ جائے، اصرار کرنے لگا کہ وہ آرام سے گھر میں رہ کر پکانے کا کام کرے اور چارہ ڈھونڈنے کی ذمہ داری اس پر چھوڑ دے۔

پوای کچھ ردوکد کے بعد مان گیا اور آرام سے گھر میں وقت بتانے لگا۔ لیکن کوہ شویانگ چونکہ بالکل بے آباد پہاڑ نہ تھا، اس لئے وقت کے ساتھ ساتھ اس کا مزاج بھی بدلتا گیا۔ وہ اپنی طبعی کم گوئی چھوڑ کر باتونی بن گیا اور پہاڑ پر آنے والے بچوں یا لکڑھاروں سے ہر وقت باتیں کرتا رہتا۔ ایک دن شاید وہ بہت چہک رہا تھا یا پھر کسی نے اسے بڈھا بھکاری کہہ دیا تھا کہ اس نے باتوں باتوں میں اپنی اصلیت ظاہر کردی۔ کچھ لوگوں کو اس نے بتادیا کہ وہ اس کا بھائی لیاؤشی میں چو کے بادشاہ کے بیٹے تھے۔ وہ سب سے بڑا اور شوچھی تیسرا بھائی تھا۔ باپ نے تیسرے بھائی کو ولی عہد چنا تھا مگر جب باپ بستر مرگ پر تھا تو تیسرے بھائی نے اس کے حق میں دستبرداری پر اصرار کیا۔ باپ کی وصیت پوری کرنے اور ہنگامے سے بچنے کی خاطر وہ بھاگ نکلا اور تیسرے بھائی نے بھی یہی راستہ اپنایا۔ ایک دن دونوں بھائیوں کی سڑک پر ملاقات ہوگئی۔ دونوں بھائیوں کی سڑک پر ملاقات ہوگئی۔ دونوں مغرب کے نواب_ بادشاہ ون کے پاس

گئے اور پھر بوڑھوں کے آرام گھر میں رہنے لگے۔اس کے بعد چو کے موجودہ بادشاہ نے اپنے والی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو ان دونوں بھائیوں پر چوکا اناج گویا حرام ہو گیا اور وہ بھاگ کر کوہ شویانگ پر آ گئے۔ اور جڑی بوٹیاں کھا کر گزارہ کرنے لگے....

شوچھی نے جب یہ واردات سنی تو وقت نکل چکا تھا_بات پھیل چکی تھی۔اس نے بڑے بھائی سے تو کچھ نہ کہا،مگر دل میں سوچنے لگا،''ابا نے اسے ولی عہد نہ بنا کر بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا تھا۔''

شوچھی کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔بھید کھلنے کا نتیجہ اچھا نہ رہا۔گاؤں میں ان کے متعلق نت نئی افواہیں چل نکلیں اور لوگ صرف انہیں دیکھنے کے لئے پہاڑ پر آنے جانے لگے۔کوئی انہیں بہت بڑا آدمی قرار دیتا،کوئی شیطان کہتا اور کوئی عجوبہ سمجھتا۔وہ چارہ چننے نکلتے تو لوگ پیچھے پیچھے چلے آتے،محض یہ دیکھنے کو کہ وہ چارہ کیسے چنتے تھے۔کھانا کھانے بیٹھتے تو لوگ ہونقوں کی مانند ان کا دیکھتے رہتے کہ وہ کھاتے کیسے تھے۔ساتھ ہی ساتھ آپس میں طرح طرح کے اشارے بھی کرتے اور ایسے ایسے سوال پوچھتے کہ ان کا سر چکرا جاتا۔بہر طور، وہ شائستگی کا دامن نہ چھوڑ سکتے تھے، کیونکہ ذرا سی برہمی یا تیوری کا بل انہیں ''بدمزاج''مشہور کر سکتا تھا۔

ان کے بارے میں لوگوں کی رائے بالعموم اچھی تھی۔بعد میں تو کچھ نوجوان عورتیں بھی انہیں دیکھنے چلی آئیں۔مگر واپسی پر سر ہلا کر اعلان کر دیا کہ نظارہ دیکھ کر''کچھ لطف نہیں آیا''_انہیں سخت فریب دیا گیا تھا۔

ہوتے ہوتے شویانگ گاؤں کا سب سے بڑا کھڑپینچ نواب شیاؤ پینگ بھی ان میں دلچسپی لینے لگا۔ یہ نواب تاچی کے ماموں کی منہ بولی بیٹی کا داماد تھا اور آقائے نذر گزار☆ کے عہدے پر فائز تھا۔اس نے جب رضائے فلک میں تغیر رونما ہوتے دیکھا تو مال اسباب سے لدے پچاس چھکڑے اور آٹھ سو غلام اور باندیاں لے کر نئے چند دن پہلے ہی فوج منگ ندی پر صف بندی کر چکی تھی،اور چو کا بادشاہ عدیم الفرصتی کے سبب اس کی مناسب آؤ بھگت

☆ پرانے زمانے میں جب ضیافت ہوتی تھی تو کوئی معمر شخص دیوتاؤں کے حضور شراب نذر گزارتا تھا۔اس سے یہ نام پڑا اور ہان اور وی ادوار سے ایک سرکاری عہدہ بن گیا۔مثلاً اکادمی کا نذر گزار،شاہی کالج کا نذر گزار وغیرہ

نہ کرسکا۔ بادشاہ نے مال اسباب کے چالیس چھکڑے او رساڑھے سات سوغلام اور کنیز یں قبول کرلیں، اور اسے کوہ شویانگ کے دامن میں دو ہیکڑز زرخیز اراضی عطا کر کے علمی کام کرنے کا حکم دے دیا۔ نواب شیاؤ پینگ کوادب سے بھی شغف تھا، مگر گاؤں کے لوگ ٹھہرے بالکل ان پڑھ، علم وادب کی باتیں کیا جانتے! وہ سخت بیزار رہتا تھا اور اب جواس نے ان دو بھائیوں کی خبر سنی ت وخادموں کو پالکی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے ان سے ادب خصوصاً شاعری پر گفتگو رہے۔ وہ خود شاعر تھا اور پوری بیاض تیار کر رکھی تھی۔

لیکن ان سے گفتگو کے بعد وہ جب واپسی کے لئے پالکی میں سوار ہوا تو وہ بڑا مایوس تھا، اور گھر پہنچ کر وہ اپنا غصہ نکالنے لگا۔ اس کے خیال میں پرانی وضع کے یہ دونوں بڈھے شاعری پر گفتگو کی صلاحیت سے عاری تھے۔ اول تو وہ غریب تھے۔ سارا دن اس چکر میں گزار دیتے تھے کہ پیٹ کی آگ بجھانے کا کوئی راستہ نکل آئے۔ ایسے میں وہ اچھے شعر کیونکہ کہہ سکتے تھے؟ دوسرے، ''ذاتی اغراض'' کی پٹی ان کی آنکھوں پر بندھی ہوئی تھی، اس لئے وہ شاعری میں حسن ''اعتدال'' سے عاری تھے۔ تیسرے، اپنے عیاں نقطہ نظر کے سبب وہ شاعری میں حسن ''رواداری'' ☆ سے

☆ ''کتاب رسوم'' میں کنفیوشس کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ اعتدال اور رواداری کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔ اور یہ بات جاگیردارانہ دور کے چین میں ادب اور تنقید نگاری کی کسوٹی بن گئی تھی۔

بھی عاری تھے۔ اور بدترین بات یہ کہ وہ تضادات کا مجموعہ تھے۔ لہذا اس نے مغلوب الغضب ہو کر دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا:

''چونکہ 'آسمانوں تلے ساری دھرتی ہمارے حکمران کی ملکیت ہے'، اس لئے کیا چارہ بھی ہمارے بادشاہ کی ملکیت میں نہیں آتا؟''

ادھر، پو ای اور شوچھی دن بدن لاغر ہوتے جا رہے تھے۔ اس کا سبب ان کی روزمرہ سماجی مصروفیات نہ تھیں، کیونکہ ملاقاتیوں کا سلسلہ کم ہونے لگا تھا، بلکہ سبب یہ کہ چارہ عنقا ہوتا جا رہا تھا۔ مٹھی بھر چارہ جمع کرنے کے لئے انہیں میلوں چلنا پڑتا تھا اور قواء جواب دے جاتے تھے۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ آدمی کنویں میں گرے تو منڈیر کا پتھر بھی ساتھ ہی سر پر آگرتا ہے۔

ایک دن وہ بیٹھے دم پخت چارہ کھا رہے تھے۔ چارے کی کمیابی کے سبب کے اب وہ سہ پہر کو دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ دفعتاً کوئی بیس سال کی ایک اجنبی عورت آ گئی۔ وہ دیکھنے میں کسی کھاتے پیتے گھرانے کی نوکرانی لگتی تھی۔

''شام کا کھانا کھا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

شوچھی نے نظریں اٹھائیں اور مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا پکایا ہے؟'' اس نے دوسرا سوال کر دیا۔

''چارہ۔'' پوا نے جواب دیا۔

''یہ کیوں کھا رہے ہو؟''

''اس لئے کہ ہم چوکا اناج نہیں کھاتے...''

پوای کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ شوچھی اسے تنبیہی نظروں سے دیکھنے لگا۔ مگر عورت خاصی تیز طرار تھی، بات کا مفہوم پا گئی۔ اس نے تحقیر آمیز قہقہہ لگایا اور مغلوب الغضب ہو کر دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا:

''''آسمانوں تلے ساری دھرتی ہمارے حکمران کی ملکیت ہے۔ تم لوگ جو چارہ کھا رہے ہو، کیا وہ ہمارے بادشاہ کی ملکیت نہیں؟''

ایک ایک لفظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح پوای اور شوچھی کے کانوں میں اترتا چلا گیا اور دونوں بے ہوش ہو گئے۔ جب وہ ہوش میں آئے تو عورت جا چکی تھی۔ وہ باقی ماندہ چارہ حلق سے نہ اتار سکے۔ اسے دیکھ کر ہی وہ احساس شرم سے پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے پرے بھی نہ ہٹا سکے۔ ان کے بازو گویا شل ہو چکے تھے۔

(6)

کوئی بیس دن بعد اتفاق سے ایک لکڑھارے کی نظر پوای شوچھی کے مردہ جسموں پر پڑ گئی۔ وہ پہاڑ کے پیچھے ایک کھوہ میں اکڑے ہوئے پڑے تھے۔ نعشیں ابھی سڑنی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ بے حد لاغر تھے، اور دوسری وجہ یہ کہ بظاہر انہیں مرے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ ان کے بھیڑ کی کھال کے استر والے چوغے البتہ غائب تھے۔ جانے کون اٹھا لے گیا تھا۔ اس خبر نے گاؤں میں

خاصی ہلچل پیدا کردی اور رات گئے تک متجسس دیہاتیوں کا ہجوم لگا رہا۔ کچھ سرگرم لوگوں نے نعشوں کو مٹی تلے دبا دیا اور وہاں ایک کتبہ نصب کرنے کی باتیں ہونے لگیں۔ تا کہ آنے والی نسلوں کے لئے ان کی یاد گار باقی رہ سکے۔

چونکہ کوئی دیہاتی لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا، اس لئے انہوں نے نواب شیاؤ پینگ سے رجوع کیا۔

لیکن نواب شیاؤ پینگ نے کتبہ لکھنے سے انکار کر دیا۔

''ان احمقوں کے لئے ؟ وہ کتبے کے مستحق ہی نہیں وہ بوڑھوں کے آرام گھر میں رہتے تھے، مگر سیاست سے دامن نہ بچا سکے۔ وہ کوہ شویانگ پر چلے آئے، لیکن نظمیں کہنے پر مصر رہے۔ انہوں نے نظمیں کہیں، مگر اپنی اوقات پہچاننے اور 'فن برائے فن' کی روایت پر عمل کرنے کی بجائے خفگی کا اظہار کرتے رہے۔ تم ہی کہو، کیا اس قسم کی نظمیں کوئی دیرپا اثر رکھتی ہیں؟

ہم مغربی پہاڑ پر چڑھتے اور چارہ چنتے ہیں،
ایک ڈاکو کی جگہ دوسرا آجاتا ہے اور اپنی غلطی نہیں پہچانتا۔
شہنشاہ شن نونگ اور شون اور شیا خانوادہ تمام ہوئے،
ہم کس کی پیروی کریں؟
چلو جدا ہو جائیں! ہماری قسمت ہی کھوٹی ہے!

میں تم ہی لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کس قسم کی یاوہ گوئی ہے؟ شاعری میں اعتدال اور رواداری لازم ہے۔ ان کے یہ اشعار محض 'نوحے' ہی نہیں، سیدھی سادھی گالیاں ہیں۔ پھولوں کے بغیر تو کوئی کانٹوں کو بھی برداشت نہیں کرتا، چہ جائیکہ گالیاں سہہ سکے۔ خیر ادب کو چھوڑو، انہوں نے اسلاف کی سرزمین چھوڑ کر اپنی غداری کا ثبوت دیا ہے۔ حکومت کی پالیسیوں کی ہدف ملامت بنانا اچھے شہریوں کا وطیرہ نہیں ہوتا ...میں کتبہ نہیں لکھوں گا!''

اس کی باتیں ان پڑھ گاؤں والوں کے سروں پر سے گزر گئیں، تاہم اس کا غصہ دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ وہ کتبہ لگانے کے خلاف تھا۔ لہذا انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور یوں پوای اور شوچھی کی تجہیز و تکفین کی رسوم ختم ہو گئیں۔

بہر حال، گرمیوں کی راتوں میں گاؤں والے باہر خنکی میں بیٹھ کر اکثر دونوں بھائیوں کا ذکر چھیڑ

دیتے۔کوئی کہتا کہ ان کی موت بڑھاپے کے سبب ہوئی،کوئی یہ خیال ظاہر کرتا کہ وہ بیمار تھے اور کچھ یہ دور کی کوڑی لاتے کہ چوغوں کی خاطر ڈاکوؤں نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔اور آخر میں یہ بات آشکار ہوگئی کہ انہوں نے فاقوں سے جان دے دی تھی، کیونکہ نواب شیاؤ پینگ کی نوکرانی آہ چن نے بھید کھول دیا کہ وہ ان کی موت سے کوئی پندرہ دن پہلے یونہی ان کا مذاق اڑانے پہاڑ پر گئی تھی۔دونوں احمق غصے میں آ گئے ہوں گے اور اسی عالم میں بھوک سے دم توڑ دیا ہوگا۔

یہ کہانی سن کر بہت سے لوگ آہ چن کی ذہانت کے معترف ہوگئے،لیکن ایسے بھی تھے جنہوں نے اس ظلم پر اسے ملامت کی۔

جہاں تک آہ چن کا تعلق تھا، وہ پوای اور شوچھی کی موت کی ذمہ داری اپنے سر لینے سے انکار کرتی رہی۔مانا کہ وہ ان کا مذاق اڑانے پہاڑ پر گئی تھی،لیکن اس کی نظر میں یہ محض ایک مذاق تھا۔یہ بھی مانا کہ ان احمقوں نے غصے میں آ کر کھانا پینا چھوڑ دیا ہوگا،لیکن یہ بھوک ہڑتال ان کے لئے موت کی بجائے ایک غیر متوقع نعمت لے کر آئی تھی۔

''آسمان بڑا مہربان ہے۔'' وہ کہنے لگی،''جب اس نے انہیں بھوک سے بلکتے دیکھے تو ایک ہرنی کو حکم دیا کہ انہیں دودھ پلائے۔میں تم لوگوں سے پوچھتی ہوں کہ اس سے عمدہ بات اور کیا ہوسکتی تھی؟ نہ ہل جوتنے کا تردد، نہ ایندھن کاٹنے کی مشقت۔بس دن بھر بیٹھے رہو۔بھوک لگے تو ہرنی آ کر دودھ پلائے جائے۔وہ تیسرا بھائی، جانے کیا نام تھا اس کا، یہی چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دودھ مل جائے۔ہرنی کا دودھ اس کے لئے کافی نہ ہوتا تھا۔دودھ پیتے پیتے اس نے سوچا،'یہ ہرنی خوب موٹی تازی ہے!اس کا گوشت بڑا لذیذ ہوگا!'اس نے آنکھ بچا کر پتھر اٹھا کر اسے مارنے کی کوشش کی۔لیکن وہ تو آسمانی ہرنی تھی انسانی ارادوں کو فوراً بھانپ جاتی تھی۔لہذا چھلاوے کی طرح غائب ہوگئی۔ادھر، آسمانی دیوتا ان کی حرص دیکھ کر بیزار ہوگیا اور ہرنی کو حکم دیا کہ آئندہ انہیں دودھ پلانے نہ جائے۔اب تم لوگ خود ہی جان لو کہ وہ صرف اور صرف اپنی حرص اور طمع کے ہاتھوں انجام کو پہنچے...''

سننے والوں نے کہانی ختم ہونے پر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور یوں محسوس کیا گویا ان کے کندھوں سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔اس کے بعد جب کبھی انہیں پوای اور شوچھی کا خیال آتا، ان کی نظروں کے سامنے دو ایسے آدمیوں کے ہیولے ناچنے لگتے جو چوٹی آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوتے تھے اور ہرنی کو پھاڑ

کھانے کے لئے ان کے سفید داڑھیوں والے منہ کھلے ہوتے تھے۔

درے سے روانگی

(1)

لاؤزی ☆ کاٹھ کا بت بنا بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔

''استاد محترم، کھونگ چھیو☆ ☆ پھر آ گیا ہے!''

اس کے چیلے کنگ سانگ چھو نے کسی قدر خفگی کے ساتھ اندر آتے ہوئے کہا۔

''اندر بلا لو...''

''مزاج کیسے ہیں، استاد محترم؟'' کنفیوشس نے ادب سے جھکتے ہوئے پوچھا۔

''جیسے ہمیشہ ہوتے ہیں۔'' لاؤزی نے جواب دیا، ''تم اپنی کہو، کیا ہمارے ذخیرے کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں؟''

''جی ہاں، لیکن ...'' یہ پہلا موقع تھا کہ کنفیوشس کچھ بوکھلا گیا۔ ''میں نے چھ ادبیات عالیہ کا مطالعہ کیا:

☆ ازمنہ قدیم کا ایک چینی فلسفی جو ''بیکار باش'' مکتب فکر کا بانی تھا۔ وہ بہار و خزاں کے زمانے کی ریاست چو کا باشندہ تھا۔

☆ ☆ کنفیوشس

< < کتاب نغمات > >، < < کتاب تاریخ > >، < < کتاب رسوم > >، < < کتاب موسیقی >>، << کتاب تغیر >> اور <<بہار وخزاں کے واقعات >>۔ اپنی فہم کے مطابق میں نے ان تمام کتابوں میں دستگاہ حاصل کر لی ہے۔ میں نے بہتر شہزادوں سے ملاقات کی، مگر کوئی بھی میرا مشورہ قبول کرنے نہ ہوا۔ کسی کو سمجھانا واقعی بے حد دشوار ہوتا ہے۔ یا پھر شاید ہمارے سمجھانے کا انداز مشکل ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ بات دوسرے کی سمجھ میں نہیں آ پاتی؟''

''خوش نصیبی سمجھو کہ تمہیں کسی قابل حکمران سے پالا نہیں پڑا۔'' لاؤزی نے جواب دیا، ''چھ ادبیات عالیہ ماضی کے بادشاہوں کا چھوڑا ہوا فرسودہ راستہ ہیں، وہ کئی راہیں کیونکہ دکھا سکتی ہیں؟ تمہاری باتیں ایسے رستے کی مانند ہیں جسے کھڑاؤں سے روندا گیا ہو۔ لیکن کھڑاؤیں راہ کی مثل نہیں ہو سکتیں۔'' قدرے توقف کے بعد اس نے بات جاری رکھی، ''سفید بگلے صرف نظریں جما کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور مادہ حاملہ ہو جاتی ہے۔ حشرات میں سے نر ہوا کی سمت رخ کر کے پکارتا ہے اور مادہ ہوا کے برعکس رخ کر کے پکارتا ہے اور مادہ ہوا کے برعکس رخ کر کے جواب دیتی ہے اور پیٹ سے ہو جاتی ہے۔ مخنثوں میں سے کچھ دو جنسے ہوتے ہیں اور اپنے آپ حاملہ ہو جاتے ہیں۔ فطرت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا، تقدیر بدلی نہیں جا سکتی، وقت کو روکا نہیں جا سکتا، مسلک کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کی جا سکتی۔ تمہارے پاس مسلک ہے تو ہر شے ممکن ہے۔ اگر مسلک کھو دو تو کچھ ممکن نہیں رہے گا۔''

کنفیوشس وہاں یوں بیٹھا تھا جیسے کسی نے اس کے سر پر لٹھ مار دیا ہو اور اس کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ گئی ہو۔ وہ کاٹھ کا بت بنا بیٹھا تھا۔

آٹھ نو منٹ گزر گئے۔ اس نے گہری سانس لی اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اس درس پر حسب معمول بڑے ادب سے استاد کا شکریہ ادا کیا۔

لاؤزی نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔ وہ بھی اٹھا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا اسے لائبریری کے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ اور جب کنفیوشس اپنی بگھی پر سوار ہو رہا تھا۔ تو لاؤزی بڑے میکانکی انداز میں بڑبڑایا:

''جا رہے ہو؟ چائے تو پیتے جاتے؟...''

''شکریہ۔''

کنفیوشس بگھی پر سوار ہو گیا اور بڑے ادب سے دونوں ہاتھ جوڑ کر خدا حافظ کہا۔ ژان یو☆ نے چابک ہوا میں لہرا کر ٹخ ٹخ کیا اور بگھی آگے بڑھ گئی۔ وہ کوئی دس گز دور چلی گئی، تو لاؤزی اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

''استاد محترم، آج آپ بڑے خوش دکھائی دے رہے ہیں۔'' لاؤزی نے اپنی نشست سنبھالی تو کنگ سانگ چھو نے کہا جو اس کے پہلو میں مودب کھڑا تھا، ''آپ نے تو خاص تقریر کر دی...''

☆کنفیوشس کا ایک شاگرد۔

''ہاں۔'' لاؤزی نے دھیمی سی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے تھکن آمیز لہجے میں کہا، ''کچھ زیادہ ہی کہہ گیا۔'' پھر دفعتاً اسے کوئی خیال آ گیا۔ ''وہ جنگلی راج ہنس کیا ہوا جو کھونگ چھیو نے مجھے دیا تھا؟ کیا اسے خشک کر کے نمک لگا دیا تھا؟ اسے پکا کر کھا لو۔ میرے تو دانت ہی نہیں۔ میں کیا کروں گا اس کا۔''

کنگ سانگ چھو باہر چلا گیا۔ لاؤزی نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ لائبریری میں چاروں طرف سکوت چھا گیا۔ بس اس بانس کے چھجے سے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی جس پر سے کنگ سانگ چھو راج ہنس اتار کر لے گیا تھا۔

تین مہینے بیت گئے۔ لاؤزی حسب معمولی کاٹھ کے بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔

''استاد محترم! کھونگ چھیو پھر آ گیا ہے!'' شاگرد کنگ سانگ چھو نے قدرے حیرت آمیز لہجے میں سرگوشی کی، ''وہ عرصے سے ادھر نہیں آیا تھا۔ جانے آج اس کی آمد کا مقصد کیا ہے؟...''

''اندر بلا لاؤ...'' لاؤزی نے حسب معمولی مختصر بات کی۔

''کیسے مزاج ہیں، استاد محترم؟'' کنفیوشس نے ادب سے جھکتے ہوئے پوچھا۔

''جیسے ہمیشہ ہوتے ہیں۔'' لاؤزی نے جواب دیا، ''کہاں رہے اتنے دن، یقیناً گھر میں بیٹھ کر مطالعہ کرتے رہے ہو گے؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' کنفیوشس نے مودب لہجے میں تردید کرتے ہوئے کہا، ''میں گھر میں بیٹھا بس سوچتا رہا۔ مجھے ادراک کی ایک کرن دکھائی دی ہے: کوے اور چڑیاں ایک دوسرے کو ٹھونگیں مارتے ہیں، مچھلیاں اپنے لعاب سے ایک دوسرے کو بھگوتی ہیں، حشرات روپ بدل لیتے ہیں۔ چھوٹا بھائی پیدا ہونے والا ہوتا ہے تو بڑا بھائی روتا ہے۔ میں جو خود مدت مدید سے آواگون کے چکر سے الگ کیا جا چکا ہوں، دوسروں کو تبدیل کیسے کر سکتا ہوں؟...''

ہاں، یہ بات تو ہے۔'' لاؤزی نے جواب دیا، ''تم ادراک حاصل کر چکے ہو۔''

دونوں کو چپ سی لگ گئی اور وہ کاٹھ کے بت سے بنے بیٹھے رہے۔

آٹھ نو منٹ گزر گئے۔ کنفیوشس نے گہری سانس لی اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے روانگی سے قبل حسب معمولی بڑے ادب کے ساتھ درس پر استاد کا شکریہ ادا کیا۔

لاؤزی نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔ وہ بھی اٹھا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا اسے خدا حافظ کہنے لائبریری

کے دروازے تک آیا۔ کنفیوشس بگھی میں سوار ہونے لگا تو بوڑھا میکانکی انداز میں بڑبڑایا:

''جا رہے ہو؟ چائے تو پیتے جاتے....''

''شکریہ!''

کنفیوشس بگھی میں سوار ہو گیا اور اس نے بڑے ادب سے دونوں ہاتھ جوڑ کر خدا حافظ کہا۔ ژان یو نے چابک لہرا کر ٹخ ٹخ کیا اور بگھی آگے بڑھ گئی۔ وہ کوئی دس گز آگے چلی گئی تو لاؤزی اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

''استادِ محترم، آج آپ بڑے مضمحل دکھائی دے رہے ہیں۔'' لاؤزی نے اپنی نشست سنبھالی تو کنگ سانگ چھو نے کہا جو اس کے پہلو میں مودب کھڑا تھا، ''آپ نے بہت کم بات کی۔''

''ہاں،'' لاؤزی نے دھیمی سی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے تھکن آمیز لہجے میں کہا، ''مگر تم نہ سمجھو گے۔ سوچتا ہوں، اب مجھے چل دینا چاہیئے۔''

''کیوں؟'' اگر اچانک بجلی گر پڑتی تو بھی کنگ سانگ چھو اتنا حیران نہ ہوتا۔

''کھونگ چھیو میرے خیالات کو سمجھ گیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ صرف میں ہی اس کی حقیقت جاننے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ اور یہی بات اسے بے چین کئے رکھتی ہے۔ اگر میں نہ گیا تو معاملہ پریشان کن...''

''مگر کیا وہ بھی اسی مسلک کا پیرو نہیں؟ آپ کو جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''نہیں۔'' لاؤزی نے نفی میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا، ''ہمارا مسلک ایک نہیں۔ ہماری کھڑاؤویں ایک سی ہو سکتی ہیں، مگر میری کھڑاؤویں صحراؤں کی خاک چھاننے ☆ اور اس کی درباروں میں جانے کے لئے ہیں۔''

''پھر بھی، آپ اس کے استاد ہیں!''

''اتنے برس میرے ساتھ گزارنے کے بعد بھی تم تو نرے بدھو ہی رہے۔'' لاؤزی نے مذاقاً کہا، ''اس بات میں کس قدر سچائی ہے کہ فطرت نہیں بدلی جا سکتی، تقدیر نہیں بدلی جا سکتی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ کھونگ چھیو تمہاری طرح نہیں ہے۔ وہ اب کبھی ادھر نہیں آئے گا اور نہ ہی مجھے استاد کہہ کر پکارے گا۔ وہ میرا ذکر 'وہ بڈھا' کہہ کر کیا کرے گا اور پیٹھ پیچھے برائیاں کرے گا۔''

''میں نے تو ایسا کبھی سوچا تک نہیں۔ مگر استادِ محترم، آپ کی باتیں ہمیشہ صحیح ثابت ہوتی ہیں۔ آپ

آدمیوں کے بارے میں قیافہ لگانے...''

''نہیں، شروع شروع میں میں بھی غلطیاں کر جایا کرتا تھا۔''

''خیر، یہ بات ہے تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے....'' کنگ سانگ چھونے کہا۔

لاؤزی کے چہرے پر پھر استہزائی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اچھا! یہ تو بتاؤ کہ میرے منہ میں کتنے دانت باقی ہیں؟''

''ایک بھی نہیں۔''

''کیا میرے منہ میں زبان ہے؟''

☆شمال مغربی چین کے صحرا۔

''ہاں وہ تو ہے۔''

''کیا تم میری بات سمجھے؟''

''استادِ محترم، آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ آدمی سخت چیز پہلے چباتا ہے اور نرم بعد میں؟''

''بالکل۔ میری رائے یہی ہے کہ تم بھی اب سامان باندھو اور اپنی بیوی کے پاس واپس چلے جاؤ۔ لیکن جانے سے پہلے میرے کالے بیل کو کھریرا کر دو اور کاٹھی کے کپڑے کو دھوپ دکھا دو۔ مجھے کل صبح ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔''

لاؤزی درہ ہانکو☆ کے قریب پہنچا تو شاہراہ چھوڑ کر بیل کو ایک بغلی راستے پر موڑ دیا۔ وہ دیوار کے گرد چکر لگا کر جانا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ دیوار پھلانگ جائے گا۔ دیوار زیادہ اونچی نہ تھی اور بیل کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر وہ آسانی سے اوپر چڑھ سکتا تھا۔ لیکن ایسے میں اسے بیل چھوڑنا پڑتا، کیونکہ بیل کو دیوار کے پار لیجانے کے لئے سامان اٹھانے والی کل کی ضرورت تھی۔ مگر تب تک نہ تو لو پان☆☆ پیدا ہوا تھا اور نہ ہی موتی☆☆☆☆۔

☆ایک اہم درہ تھا جس سے گزر کر قدیم زمانے کے لوگ شمال مغربی چین کا سفر کرتے تھے۔

☆☆وہ کونگ شو پان کے نام سے بھی معروف تھا۔ اپنے زمانے کا مشہور دستکار اور ریاست لو کا ایک نامور موجد تھا۔

☆☆☆قدیم چینی فلسفی موہسٹ مکتب فکر کا بانی تھا۔ اس کی کتاب اس کے شاگردوں نے

مرتب کی۔ یہ کہانی اس کتاب کے ایک باب پر مبنی ہے۔
اور لاؤزی ایسی کسی کل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ قصہ مختصر، اس نے بہتیرا فلسفہ بگھارا مگر کوئی طریقہ سجھائی نہ دیا۔

ادھر اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ایک مخبر نے اسے بغلی سڑک پر مڑتے دیکھ لیا تھا۔ اور درے کے نگران کو اطلاع دے چکا تھا۔ چنانچہ وہ کوئی بیس گز آگے بڑھا ہوگا کہ گھڑسواروں کے ایک دستے نے اسے آلیا۔ آگے آگے مخبر، پیچھے درے کا نگران شی، پھر چار کانسٹیبل اور دو کسٹم افسر تھے۔

''رک جاؤ۔'' ان میں سے ایک نے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

لاؤزی نے فوراً کالے بیل کی راسیں کھینچ لیں اور کاٹھ کی طرح جامد ہو کر رہ گیا۔

''ارے، ارے۔'' نگران اسے دیکھ کر حیرت آمیز لہجے میں پکارا اٹھا اور فوراً گھوڑے سے اتر کر اس کے استقبال کے لئے جھک گیا، ''میں بھی سوچ رہا تھا کہ کون ہو سکتا ہے۔ تو یہ لاؤتان☆ ہیں، کتب خانے کے ناظم اعلیٰ۔ واقعی حیرت کی بات ہے۔''

لاؤزی بھی لپک کر بیل سے اتر آیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر نگران کی طرف دیکھا اور پھر بے یقینی کے لہجے میں گویا ہوا، ''میری یادداشت اب جواب دیتی جا رہی ہے...''

☆یعنی لاؤزی۔

''ہاں، یہ تو ایک فطری بات ہے۔ آپ مجھے پہچان نہیں سکے۔ میں نگران شی ہوں، جناب۔ کچھ عرصہ قبل میں << کتاب محاصل کے گر >> کی تلاش میں لائبریری میں آیا تھا تو آپ سے ملاقات ہوئی تھی ....''

اس دوران کسٹم افسروں نے کاٹھی اور کاٹھی کا گدا کھنگالنا شروع کر دیا تھا۔ ایک نے گدے میں سوئے سے سوراخ کیا، پھر انگلی ڈال کر دیکھا اور حقارت آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا خاموشی سے پرے ہٹ گیا۔

''آپ دیوار کے پاس سیر کرنے نکلے ہیں کیا؟'' نگران شی نے پوچھا۔

''نہیں، میں تبدیلی آب وہوا کی غرض سے باہر جا رہا تھا...''

''خوب، بہت خوب۔ آج کل ہر کوئی حفظان صحت کی بات کرنے لگا ہے۔ حفظان صحت کا معاملہ

واقعی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مگر آپ کی یہاں آمد ہمارے لئے خوش بختی کی بات ہے از راہ کرم چند روز ہمارے پاس یہاں محصول خانہ میں رہیں اور اپنے درس سے ہمیں نوازیں...''

''اور اس سے پیشتر کہ لاؤزی کوئی جواب دیتا، چار کانسٹیبلوں نے اسے اٹھا کر بیل پر بٹھا دیا۔ ایک کسٹم افسر نے سوئے سے بیل کی پیٹھ میں کچوکا لگایا اور وہ دم دبا کر درے کی سمت بھاگ نکلا۔

درے میں پہنچ کر انہوں نے اس کے لئے بڑا دالان کھول دیا۔ یہ عمارت کا مرکزی کمرہ تھا اور اس کی کھڑکیوں سے زرد مٹی والی نشیبی زمین یوں دکھائی دیتی تھی، گویا افق تک ڈھلتی چلی گئی ہو۔ آسمان نیلا اور ہوا لطیف تھی، یہ پرشکوہ گڑھی ایک ڈھلوان پر تعمیر کی گئی تھی اور پھاٹک کے دونوں اطراف ایسا کھڑا نشیب تھا کہ بیچوں بیچ گزرنے والا راستہ یوں لگتا تھا جیسے دو کھڑی چٹانوں کے درمیان بل کھاتا چلا گیا ہو۔ مٹی کا ایک تودہ اس راستے کو بند کر سکتا تھا۔

انہوں نے کچھ ابلا پانی پیا اور فطیری روٹی کھائی۔ لاؤزی نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر نگران شی نے اسے درس کی دعوت دے دی۔ انکار ممکن نہ تھا، لہذا لاؤزی نے فوراً ہامی بھر لی۔ لوگ دالان میں آئے تو ان میں جیسے بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ جو آٹھ آدمی اسے گھیر کر لائے تھے، ان کے علاوہ حاضرین میں چار اور کانسٹیبل، دو کسٹم افسر، پانچ مخبر، ایک وقائع نگار، ایک خزانچی اور ایک باورچی شامل تھے۔ ان میں سے بعض یادداشتیں لکھنے کے لئے موقلم، چاقو اور چوبی لوحیں☆ لے کر آئے تھے۔

لاؤزی کاٹھ کے بت کی طرح دالان کے وسط میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گہری خاموشی چھائی رہی پھر وہ چند بار کھانسا اور سفید داڑھی کے پیچھے اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ تمام لوگ دم سادھے اس کی باتیں سننے کے لئے تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بولنے لگا۔

☆ کاغذ کی ایجاد سے قبل ہر قسم کی تحریریں بانس یا لکڑی کی لوحوں پر لکھی جاتی تھیں اور غلطیاں چاقو سے صاف کی جاتی تھیں۔

مسلک جس کا ہم پرچار کرتے ہیں، کوئی دائمی مسلک نہیں،
نام جو ہم لیتے ہیں، کوئی دائمی نام نہیں۔
یہ عدم ہی تھا جس سے زمین و آسمان وجود میں آئے،
نام حقیقت میں ماں ہے جو دسیوں ہزار مخلوق کو جنم دیتی ہے، بالکل اپنی ہی شبیہہ میں...☆

سامعین ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔کسی نے کوئی یادداشت نہ لی۔لاؤزی نے بات جاری رکھی:

سچ تو یہ ہے کہ ''جو ہمیشہ کے لئے نفس مار لیتا
ہے وہی باطن کے اسرار تک پہنچ پاتا ہے''۔
جو نفس کو نہیں مار پاتا، صرف ظاہر کو دیکھ سکتا ہے۔
یہ دونوں باتیں ایک ہی سانچے سے جنم لیتی
ہیں، مگر مختلف نام پاتی ہیں۔
اس سانچے کو ہم اسرار قرار دیتے ہیں،
یا ''اسرار سے بھی زیادہ تاریک،''
در جہاں سے باطن کی حقیقتیں جنم لیتی ہیں...

☆ یہ اور موحرالذکر اقوال <<مسلک اور اس کی قوت>> سے لئے گئے ہیں۔

ہر چہرے پر مایوسی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔کچھ ایسے تھے کہ بات کا سر پیر ہی ان کی فہم سے باہر تھا ایک کسٹم افسر نے بھرپور جماہی لی، وقائع نگار گہری نیند میں ڈوب چکا تھا اور اس کا چاقو، موقلم اور چوبی لوحیں چٹائی پر بکھری پڑی تھیں۔

لاؤزی ان تمام باتوں سے بے نیاز جزئیات بیان کرنے میں مگن تھا۔تاہم اس کے منہ میں چونکہ دانت نہ تھے لہذا اس کا تلفظ صاف نہ تھا۔اس کے شینشی کے لہجے نے ہونانی لہجے میں مل کر ''ل'' کو ''ن'' بنا دیا اور وہ ہر بات ''اڑ'' پر ختم کرتا تھا۔سامعین اس کے مفہوم کی تہہ تک ہی نہ پہنچ پاتے تھے، اور جب اس نے جزئیات بیان کرنا شروع کیں تو ان کی بیچارگی دوچند ہوگئی۔

بہرحال، منہ رکھنے کی خاطر وہ اسے سن رہے تھے۔دھیرے دھیرے کچھ لمبے پڑ گئے، بعض ادھر ادھر کھسک کر اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے۔آخر کار لاؤزی نے درس ختم کرتے ہوئے کہا:

''دانا کا مسلک یہ ہے کہ سعی کے بنا عمل کرے۔''

وہ خاموش ہو گیا، مگر حاضرین میں ہلکی سی جنبش بھی پیدا نہ ہوئی۔لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے مزید کہا، ''بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔''

اس پر یوں محسوس ہوا جیسے سامعین گہری نیند سے بیدار ہوگئے ہوں۔ اتنی دیر بیٹھنے سے ان کی ٹانگیں شل ہوچکی تھیں۔ وہ بعجلت اٹھ نہ سکے، لیکن ان کے دلوں میں وہی حیرت آمیز خوشی رقصاں تھی جو قیدی معافی کا اعلان سننے پر محسوس کرتے ہیں۔

لاؤزی کو ایک بغلی کمرے میں لے جایا گیا اور اس سے دوخواست کی گئی کہ وہ کچھ دیر آرام کرلے۔ ابلے پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد وہ کاٹھ کے بت کی طرح بھرے حس وحرکت بیٹھ گیا۔

اس اثنا میں باہر گرما گرم بحث چھڑ گئی اور تھوڑی دیر بعد چار نمائندے اس سے ملنے آ گئے۔ ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا: چونکہ وہ بہت تیز تیز بولتا رہا تھا اور اس کا لہجہ بھی معیاری نہ تھا اس لئے کوئی شخص بھی یادداشتیں قلمبند نہیں کر سکا تھا۔ اور یہ بڑے افسوس کی بات ہوگئی کہ اس کے درس کا کوئی ریکارڈ نہ ہو لہذا اس سے درخواست کی جائے گی کہ وہ درس کی موٹی موٹی باتیں قلمبند کردے۔

''اس نے کیا کہا؟ میرے پلے تو ایک لفظ نہیں پڑا!'' خزانچی نے جس کا اپنا لہجہ گنوارو سا تھا، چلا کر کہا۔

''مناسب تو یہی ہوگا کہ آپ سب کچھ لکھ دیں۔'' وقائع نگار نے سوچ کے لہجے میں کہا، ''آپ سارا کچھ لکھ دیں گے تو پھر آپ کو بولنے کی حاجت نہیں رہے گی۔''

ان کی باتیں بھی لاؤزی کے پلے نہ پڑیں۔ لیکن انہوں نے چونکہ موقلم، چاقو اور چوبی لوحیں اس کے سامنے رکھ دیں، اس لئے وہ جان گیا کہ وہ اس کے درس کی نقل چاہتے تھے۔ اور چونکہ انکار کی گنجائش نہ تھی، لہذا اس نے فوراً ہامی بھر لی۔ وقت خاصا بیت چکا تھا، چنانچہ جب اس نے وعدہ کیا کہ اگلی صبح کام شروع کردے گا تو وفد بات چیت کے نتائج سے مطمئن ہوکر لوٹ گیا۔

دن چڑھا تو آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ لاؤزی کی طبیعت کسلمند تھی، پھر بھی وہ کام میں جٹ گیا۔ وہ جلد از جلد درے سے نکلنا چاہتا تھا اور یہ بات درس کی نقل تیار کئے بنا ممکن نہ تھی۔ چوبی لوحوں کا ڈھیر دیکھ کر اس کی طبیعت اور بھی خراب ہوگئی۔

تاہم کسی بیزاری کا اظہار کئے بغیر اس نے خاموشی سے لکھنا شروع کردیا۔ اس نے گزرے دن کی باتیں سوچیں اور جو کچھ دماغ میں آتا گیا، لکھتا گیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابھی عینک ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بینائی یونہی کمزور تھی اب جو آنکھوں پر بوجھ پڑا تو سکڑ کر چیاسی ہوگئیں۔ اس نے بیچ میں

رک کر ابلا ہوا پانی پیا اور فطیری روٹی کے چند نوالے لئے، پھر بھی ڈیڑھ دن میں پانچ ہزار الفاظ سے زیادہ نہ لکھ سکا۔

''درے سے نکلنے کے لئے اتنا کافی ہوگا۔'' اس سوچا۔

اس نے ایک تانت لی، ساری لوحوں کو ایک ساتھ پرویا اور اٹھا کر لاٹھی ٹیکتا ہوا نگران شی کے دفتر میں جا پہنچا۔ اس نے مسودہ اس کے حوالے کیا اور فوراً روانگی کی اجازت مانگی۔

نگران شی مسودہ دیکھ کر بے حد خوش ہوا مگر ساتھ ہی ساتھ اس بات پر دکھی بھی تھا کہ اب لاؤزی چلا جائے گا۔ اس نے لاؤزی کو روکنے کی بہتیری کوشش کی، مگر جب ناکام رہا تو بظاہر پرملال دل سے اجازت دے دی۔ اس نے کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ کالے بیل پر کاٹھی کس دیں۔ پھر اپنے ہاتھوں سے الماری کے خانے سے نمک کا ایک پڑا، تلوں کا ایک پڑا اور پندرہ فطیری روٹیاں نکال کر سفید تھیلے میں ڈالیں جو قبل ازیں ضبط کیا گیا تھا، اور زادراہ کے طور پر لاؤزی کو پیش کر دیا۔ اس نے یہ بات واضح کر دی کہ اس کے ساتھ معمر ادیبوں ایسا برتاؤ کیا جا رہا تھا ورنہ اگر کوئی نوجوان ادیب ہوتا تو اسے صرف دس فطیری روٹیاری جاتیں۔

لاؤزی نے بصد تشکر تھیلا قبول کر لیا اور تمام لوگوں کے ہمراہ گڑھی سے اتر آیا۔ درے کے کنارے پہنچ کر اس نے بیل کو راسوں سے تھام لیا تو نگران شی بڑے ادب سے درخواست کرنے لگا کہ وہ بیل پر سوار ہو جائے۔ اور کئی بار بڑی انکساری کے ساتھ انکار کرنے کے بعد بالآخر وہ بیل پر سوار ہو گیا۔ اس نے ساتھ آنے والوں کو الوداع کہا، بیل کی راس کو جھٹکا دیا اور وہ دھیرے دھیرے اترائی اترنے لگا۔

جلد ہی بیل نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دئے۔ سارے لوگ انہیں درے سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔ لاؤزی سات آٹھ گز دور گیا تھا اور وہ اب بھی اس کے سفید بال، زرد گاؤن، کالا بیل اور اس کا سفید تھیلا دیکھ سکتے تھے کہ گرد و غبار کا ایک جھکڑ اٹھا جس نے لاؤزی اور اس کے بیل کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ زرد مٹی کے سوا ہر شے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ لوگ محصول خانے میں لوٹ کر آئے، تو یوں محسوس کر رہے تھے گویا کوئی بڑا بوجھ سروں سے اتر گیا ہو۔ اور یوں چٹخارے لے رہے تھے جیسے بڑا مال ہاتھ لگا ہو۔ چند ایک نگران شی کے ساتھ اس کے دفتر تک چلے آئے۔

''تو یہ ہے مسودہ؟'' خزانچی نے چوبی لوحوں کا ایک جز اٹھاتے ہوئے کہا، ''کم از کم لکھائی تو اچھی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ بازار میں اس کا کوئی نہ کوئی گاہک مل جائے گا۔''

وقائع نگار آگے بڑھ کر ایک لوح پڑھنے لگا:

'' 'مسلک جس کا ہم پرچار کرتے ہیں، کوئی دائمی مسلک نہیں!'...اونہہ! وہی پرانا راگ۔ اسے پڑھ کر تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ میں یہ سن کر ہی بیزار ہو جاتا ہوں۔...''

''سر درد کی بہترین دوا نیند ہے۔'' خزانچی نے لوح رکھتے ہوئے کہا۔

''آہ!...مجھے تو واقعی سو جانا چاہیئے تھا۔ درحقیقت میں توقع کر رہا تھا کہ وہ اپنا فسانہ عشق سنائے گا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ یہ رطب و یابس سننا پڑے گا تو اتنے گھنٹے اذیت برداشت کرنے نہ جاتا...''

''یہ تمہاری اپنی غلطی ہے کہ آدمی کو پہچان نہ سکے۔'' نگران شی نے ہنستے ہوئے کہا، ''اس کا فسانہ عشق کیا ہو سکتا تھا؟ وہ کبھی دام محبت میں گرفتار نہیں ہوا۔''

آپ کو کیسے معلوم؟'' وقائع نگار نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تم نے اسے یہ کہتے نہیں سنا تھا کہ 'بے عملی سے ہر شے کو حرکت میں لایا جا سکتا ہے'؟ یہ بھی تمہاری اپنی غلطی تھی کہ وہاں سونے چلے گئے۔ بڈھے کی 'خواہش آسمان جتنی اونچی اور تقدیر کاغذ کی مانند مہین ہے'، ☆جب وہ ہر شے کو متحرک کرنا چاہتا ہے تو خود 'بے عمل' ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کسی شے سے پیار شروع کر دیتا تو اسے ہر شے سے پیار کرنا پڑتا۔ لہذا وہ دام محبت میں کیسے گرفتار ہو سکتا تھا؟ کیا وہ یہ ہمت کر سکتا تھا؟ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو: لڑکی حسین ہو یا بدشکل، اسے دیکھتے ہی لٹو ہو جاتے ہو۔ جب اپنے خزانچی کی طرح شادی کر لو گے تو عقل ٹھکانے آ جائے گی۔''

باہر پھر ہوا کا جھکڑ اٹھا اور انہیں سردی محسوس ہونے لگی۔

''مگر یہ بڈھا جا کہاں رہا ہے؟ آخر اس کے ارادے کیا ہیں؟'' وقائع نگار نے موقع مناسب جان کر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

☆مشہور کلاسیکی چینی ناول <<لال حویلی کا خواب>> سے ایک اقتباس۔

''بقول اس کے وہ صحراؤں کی طرف جا رہا ہے۔'' نگران شی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا، ''وہ اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اسے وہاں نمک ملے گا نہ آٹا، اور پانی بھی نایاب ہوگا۔ بھوک

سے بلبلائے گا تو لوٹ آئے گا۔''

''تب تو ہم اسے ایک کتاب لکھوالیں گے۔'' خزانچی چہک اٹھا، ''لیکن اسے صرف فطیری روٹی پر گزارکرنا پڑے گا۔ ہم اسے بتادیں گے کہ اصول بدل گیا ہے اور اب ہم نوجوان ادیبوں کی حوصلہ افزائی کررہے ہیں۔ ہم اسے ایسی کتاب کے لئے صرف پانچ فطیری روٹیاں دیں گے۔''

''ممکن ہے وہ منظور نہ کرے۔ وہ بڑبڑائے گا یا پھر ہلہ مچادے گا۔''

''بھوکا ہوا تو مچانے کی ہمت کیسے کرے گا؟''

''مجھے تو صرف یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کوئی بھی یہ یا وہ گوئی پڑھنے پر تیار نہ ہوگا۔'' وقائع نگار نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا، ''ممکن ہے اس کتاب کے عوض ہمیں پانچ روٹیوں کی قیمت کے برابر پیسے بھی نہ ملیں۔ مثال کے طور پر، جو کچھ وہ کہتا ہے اگر سچ ہے تو ہمارے سربراہ کو درے کی نگرانی کا کام چھوڑ دینا چاہیئے۔ صرف اسی صورت میں وہ بے عملی حاصل کرسکتا ہے اور واقعی اہم شخصیت بن سکتا ہے...''

''فکر مت کرو۔'' خزانچی نے دخل در معقولات کیا، ''کچھ پڑھنے والے لوگ ضرور مل جائیں گے۔ کیا بہت سے ایسے نگران موجود نہیں جو سبکدوش ہوچکے ہیں اور ایسے گوشہ نشینوں کی بھی بہتات نہیں جو ابھی نگران نہیں بنے؟...''

باہر ہوا کا ایک اور جھکڑا اٹھا اور زرد دھول نے آدھے آسمان کو تاریکی میں ڈبو دیا۔ نگران نے دروازے کی طرف دیکھا تو کئی کانسٹیبل اور مخبر ہنوز وہاں کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

''تم لوگ کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے چلا کر کہا، ''اندھیرا پھیل رہا ہے۔ کیا یہی وقت نہیں جب دیوار کے آر پار سے ممنوعہ اشیا چوری چھپے لائی جاتی ہیں؟ جاؤ، جا کر پہرہ دو۔''

باہر کھڑے آدمی چمپت ہوگئے۔ اندر بھی سکوت چھا گیا۔ وقائع نگار اور خزانچی رخصت ہولئے۔ نگران شی نے آشتین سے میز کی گرد جھاڑی، پھر چوبی لوحیں اٹھائیں اور نمک، تلوں، کپڑوں، پھلیوں، فطیری روٹیوں اور دوسری ضبط شدہ اشیا کے ساتھ الماری کے اوپر رکھ دیں۔

نظم

14

اے میرے محبوب۔

مجھے خوب یاد ہے۔

جب میں محبت کے رموز واسرار سے ناواقف تھا۔

جب مجھے حسن کی عشوہ طرازیوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

جب میں تیری سنبلیں زلفوں کے پیچ وخم سے نا آشنا تھا۔

تو محبت کی بھیک مانگنے کے لئے کئی بار میری کٹیا کے دروازے پر آئی۔

تو نے بار بار کٹیا کے دروازے کی چوکھٹ کو بوسہ دیا۔

تو نے ہر بار اپنی پر خلوص محبت کا یقین دلایا۔

اور مجھے اپنے دام فریب میں پھانسنے کی کوشش کی۔

میں ترے ہر فریب سے بچتا رہا۔

لیکن۔کب تک،اور تا بہ کے،آخر تو نے مجھے اپنی زلفوں کے تنگ حلقوں میں جکڑ لیا۔

اور بھونرے کی طرح میرا رس چوسنا شروع کر دیا۔

میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دیا۔

تو نے مجھے اپنا قیدی بنا کر۔قدم۔قدم پر مجھے ٹھوکر ماری۔

اور انتقام کے ہتھوڑے سے میرے آئینہ دل کو چور چور کر دیا۔

نگاہ التفات کے بعد تری یہ کور چشمی۔

اے حوّا کی بیٹی_ اگر آدم کا فرزند ترے جذبات کی یوں تذلیل وتحقیر کرتا۔

تُو تو انتقام میں کیا کچھ نہ کر گزرتی؟

کیا کیا دشنام نہ دیتی؟

میں سوچتا ہوں۔

کیا ہر دوشیزہ کا بوسہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہ دل کا داغ بن کر اُبھر آئے۔
نسیم سحر_ گدگدا کر کلی کو پھول بنا دیتی تھی۔
لیکن یہ صرف بھونرا ہی جانتا ہے۔
کہ پھول کا سینہ کیسے اور کیونکر چاک ہوا۔

بیوہ کا بیٹا

یہ ایک بیوہ کے بیٹے کی ایسی کہانی ہے جو دو طرح اختتام پذیر ہوتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی چھوٹے سے دور افتادہ گاؤں میں ایک کھڑی چٹان کے دامن میں کوئی بیوہ رہا کرتی تھی۔ اس کا ایک ہی لڑکا تھا اور سچ پوچھو تو اس کی زندگی ہی اس لڑکے سے تھی۔ وہ اسی کی خاطر زندہ تھی اور اسی کی خاطر وہ انتھک محنت مزدوری کرتی تھی اس نے بچے کو ایک اچھے سکول میں داخل کر رکھا تھا جو گاؤں سے چار میل دُور تھا۔ اس مدرسے کا استاد کم از کم اس کند ذہن استاد سے تو بہتر تھا۔ جس سے خود اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اگر چہ اسے بچے کی یہ تعلیم بہت مہنگی پڑ رہی تھی تاہم وہ اسے جاری رکھنے کے لئے شبانہ روز سینکڑوں طرح کی قربانیوں سے کام لیتی تھی۔

اس نے دل ہی میں پےّکی، کو بام عروج پر پہنچانے کے لیے بے شمار بلند منصوبے باندھ رکھے تھے اور وہ دن رات اسے ڈانتی ڈپٹتی تھی کہ اگر اس نے لائق اور ہشیار بننے کے لیے محنت نہ کی تو پھر وہ عمر بھر یا پہاڑی کے نیچے والی پتھر کی کان میں مزدور کرے گا یا سڑکوں پر دھکّے کھائے گا۔

لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اور تو اور خود پےّکی کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ سکول جاتے وقت جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتا تھا، وہ راہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھی اور جب گھر لوٹتا تھا تو وہ راہ پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہوتی تھی۔ اور کون نہیں جانتا تھا کہ پےّکی اس کے دل کی دھڑکنوں میں بس رہا تھا اور پےّکی کی ذات اس کے لیے اس فخر و ناز کا نشاط افزا پیغام تھی۔ جسے وہ ڈانٹ ڈپٹ کے پردے میں چھپائے رہتی تھی۔

پےّکی کی خاطر وہ گھنٹوں سڑک پر ادھر ادھر ٹہلتی رہتی جبکہ اس کی گائے کنارے کے کھیتوں کی گھاس

پر منہ مارنے میں مصروف نظر آتی اور اس طرح اس کے اپنے کھیت کے پتھروں میں اُگی ہوئی گھاس بچ جاتی۔اس کے کھیت میں چند ایک گوبھی کے پھول اُگتے نے۔جب ایک بھی پھول فروخت کے قابل ہوجاتا، یہ اسے قصبے میں بیچنے کے لیے چل نکلتی اگرچہ اسے اس طرح کئی بار آنا جانا پڑتا تھا مگر وہ اس آمدورفت کو بطیبِ خاطر گوارا سمجھتی کہ وہ یہ سب کچھ پے کی کی خاطر کر رہی تھی۔کڑکڑاتے جاڑے میں وہ منہ اندھیرے اٹھتی اور سانپ کی چھتریوں کو جمع کر کے انہیں سبزی کے طور پر پکاتی اور یوں پے کی کی خاطر سبزی کے پیسوں کو بچالیتی۔غرض جس طرح بھی وہ جو پیسہ جمع کر سکتی تھی۔کرتی تھی۔اور اس طرح وہ اپنی محنت ومشقت سے اپنے ہمسایہ زمینداروں کے لہلہاتے کھیتوں سے زیادہ کمالیتی اس محنت ومشقت سے غریب کی کمر دوہری ہوجاتی اور جسم کا انگ انگ پھوڑے کی طرح دُکھنے لگتا۔مگر پے کی کی خاطر یہ سب کچھ اس کے لئے کس قدر شیریں تھا۔یہ کوئی اس کے دل سے پوچھے۔

صرف انڈوں کی فروخت سے جو پیسے مل جاتے وہ نہ صرف پے کی کی متعدد کتابیں خریدنے کے لیے کافی ہوتے بلکہ انہی سے اس کے کپڑے بھی بن جاتے!

پے کی چودہ سال کا ہوگیا تھا اور اپنے سکول کے آخری درجے میں تعلیم پا رہا تھا اس کے استاد کو کامل یقین تھا کہ وہ وظیفہ پا کر شہر کے معیاری کالج میں تعلیم حاصل کرے گا۔آثار وقرائن اس کے روشن مستقبل کی گواہی دے رہے تھے اور ماں کی ڈانٹ ڈپٹ نے اس کردار کو بڑا مستحکم بنادیا تھا۔جب گرمیوں کی چھٹیوں میں میندراوں کے لڑکے اپنے اونچے درجے کے کالجوں سے نیلے سوٹ اور شوخ رنگ ٹائیاں پہنے گھروں کو لوٹتے تو لوگ ان سے بڑی عزت سے پیش آتے اور اسی عزت کے ساتھ وہ پے کی سے بھی پیش آنے لگے تھے اور اس کی ماں کے سامنے اس کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملادیتے تھے۔

جُون کے ایک دن کا ذکر ہے ہوا بوجھل بوجھل تھی اور بارش نہ ہونے سے چُوزے اور مرغیاں خشک زمین پر برہم ہوہوکر چونچیں مار رہے تھے اور پریشانی کے عالم میں سڑک کے نشیب وفراز میں بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔جس کے مارے بُرا حال تھا مگر بڑھیا تھی کہ دروازے پر کھڑی پے کی کا انتظار کر رہی تھی۔ادھر سے ایک ہمسائے کا گزر ہوا۔بوڑھا آدمی تھا۔بات کرنے کے بہانے ٹھہر گیا اور اس نے ٹوپی اتار کر منہ کو رومال سے صاف کیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔''پے کی کا انتظار کر رہی ہو بہن! آج تو غضب کی

گرمی ہے اور پے کی کے لیے اپنی پرانی سائیکل کو چلانا عذاب سے کم نہیں ہوگا۔ اگر میری پوچھو تو میں اس قیامت کی گرمی میں ان چار میلوں کو سائیکل پر طے کرنے کا کبھی نام بھی نہ لوں!''

''پے کی کو تم جانتے نہیں ہو بھائی! وہ اس سے تین گنا فاصلہ خوشی طے کر ڈالے اگر اسے یقین ہو کہ سڑک کے اس پار اسے کوئی نہ کوئی کتاب اس کی پسند کی مل جائے گی!'' بڑھیا نے بڑے فخر سے کہا۔

وقت بہت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا اور بڑھیا کی نظریں سورج پر جمی ہوئی تھیں۔ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد بڑھیا کہنے لگی۔ ''میرے خیال میں تو گرمی، بارش سے کہیں اچھی ہے۔''

ہمسائے نے دیوار کے پتھروں میں اگنے والی گھاس کے لمبے تنکے کو اکھاڑا اور اس کا ایک سرا منہ میں چباتے ہوئے اپنے خیال میں گم سا ہو کر کہنے لگا۔ ''مگر گرمی سخت ضرر رساں بھی تو ثابت ہو سکتی ہے آج ایسے دن میں لو لگنے کا اندیشہ کچھ اچنبھے کی بات نہیں ہوگی'' پھر سورج کو دیکھ کر بولا ''گرمی تو قہر خداوندی ہے۔ ادھر لو لگی اور ادھر آدمی گر کر پتھر ہوا۔ جی ہاں! لُو چشم زدن میں موت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔''

بڑھیا دروازے پر کھڑے کھڑے اور بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بیٹے کے وجود کو تلاش کرنے لگی۔ وہ پہاڑی کے اوپر سے شہر کو جانے والی راہ کو تکے جاتی تھی۔

''بہر حال، جب وہ پہاڑی سے نیچے اترے گا تو ہوا کے بے شمار ٹھنڈے جھونکے اس کے منہ سے لپٹ لپٹ جائیں گے۔''

اس نے پہاڑی کی چوٹی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''یہ بات درست کہی تم نے سال کے گرم کریں دن کو بھی اگر تم سائیکل پر سوار ہو کر پہاڑی کی بلندی سے نشیب کی طرف آؤ گی تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تمہارے ہمرکاب ہوگی یوں تمہارے گالوں سے چُھو کر گزرے گی کہ ریشمی کپڑے کا لمس معلوم ہو اور اگر جناب! سردی کا موسم ہوا تو ہَوا، ہَوا نہیں دو چاقو ہوں گے جو تلوار کی طرح تمہارے دونو پہلوؤں کو کاٹ رہے ہوں گے اور کھال یُوں ادھڑ رہی ہوگی۔ جیسے کوئی شاخِ بنات کی چھال کو چھیل رہا ہو۔'' وہ بڑی سوچ بچار سے کہہ رہا تھا۔ ''میرے خیال میں یہ پہاڑی آئر لینڈ کی بے حد اہم چٹانوں میں سے ہوگی۔ اور حقیقت میں یہ ہے وہ پہاڑی جو فی الواقعی پہاڑی کہلانے کی مستحق ہے۔'' اس نے گھاس کا تنکا منہ سے نکال لیا اور بیوہ کو بڑی متانت سے تکتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے یقین کامل ہے کہ سرکاری نقشے میں اس کا کوئی نہ کوئی نام بھی ضرور موجود ہوگا۔''

''اگر یہ بات ہے تو پے کی کی تمہیں اس کے متعلق ساری تفصیل بتا دے گا کیونکہ اگر کتاب نہ لے تو وہ اسے ہی لیے لیے پھرتا ہے۔''

''بھئی واہ! یہ تو خوب رہی، اور ہاں میں تمہیں بتا دوں کہ نقشہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ بڑی عظیم چیز ہے یہ، اور اس کا سمجھنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔''

بیوہ نے سُنی ان سُنی کر دی۔

''دیکھنے میں پیکی نظر آتا ہے۔'' یہ کہتے ہی وہ پھاٹک کھول کر سڑک پر آ گئی سامنے پہاڑی کی چوٹی پر سائیکل کے پہیئے کی تاریں چمکتی دکھائی دیں اور کوندے کی لپک کی طرح اس کی نیلی جرسی کی جھلک نظر آئی۔ پے کی نشیب کی طرف اڑتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے ہینڈل مضبوطی سے تھام رکھا تھا اس کے چمکیلے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ بے حد عمودی چٹان سے اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ آ رہا تھا کہ پہاڑی کے دامن میں بوڑھے اور بڑھیا کو یوں دکھائی دیا کہ جیسے خود نہیں بلکہ اس کے گرد و پیش کے درخت، کنارے کی گھاس عمیق کھائیاں اور جھاڑیاں بھاگی چلی آ رہی ہیں۔ مرغیوں اور چوزوں نے شورِ محشر بپا کر دیا اور وہ اپنے بچاؤ کی خاطر سڑک سے دوڑ دوڑ کر کھائیوں میں آ گئے۔ انہوں نے عورتوں کا سا داویلا مچا مچا کر سڑک کے دونو طرف بھاگ دوڑ شروع کر رکھی تھی۔ پیکی نے ماں کو ہاتھ کے اشارے سے خوش آمدید کہی وہ قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تل تک دکھائی دے رہے تھے۔

جو مرغیاں ابھی تک راستے پر کٹ کٹ کٹاک کے ساتھ ڈٹی ہوئی تھیں۔ ان کو ہٹانے کے لیے پے کی نے چلا کر آواز نکالی۔ ''شو'' اور وہ اپنی تنی ہوئی گردنوں کو آگے بڑھا بڑھا کر دوڑ اٹھیں۔

پے کی کی ماں نے بھی 'شو' کی آواز نکالی اور مرغیوں کو ڈرانے اور راہ سے ہٹانے کے لیے اپنے ایپرن کے دامن کو ہوا میں پھٹ پھٹانا شروع کر دیا۔

حادثے کے وقوعہ کے کہیں بعد جا کر بڑھیا کو خیال آیا کہ شاید وہ خود ہی اس المیہ کی ذمہ دار ہے۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ اس نے اپنے ایپرن کو اس زور سے پھٹپھٹایا تھا کٹکٹاتی ہوئی مرغی بری طرح بدک کر ایک ہی اڑان میں باغ کی دیوار سے ہوتی ہوئی سڑک کے بیچوں بیچ آ رہی تھی۔

دفعتاً بڑی مرغی سبزے سے ڈھکی ہوئی کھائی پر آ دھمکی اور متوحش نظروں سے مرغیوں اور چوزوں کو دیکھنے لگی جو دائیں بائیں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اس نے اپنے بال و پر یوں پھلا کر کھڑے کر دیئے جیسے

وہ اس کے جسم کا حصہ نہیں تھے۔ اس نے گردن آگے بڑھائی اور بے حد خوف اور گھبراہٹ سے تنداور کرخت آواز نکالتے ہوئے پھر یری جولی تو سیدھی تپتی ہوئی دُھول والی سڑک کے عین درمیان میں آ گئی۔

پّے کی نے سخت زور سے بریکیں دبائیں اور وہیں جم کر رہ گیا۔ علم اضطراب میں بیوہ نے چیخ ماری۔ پروں کا ایک جھکڑ سا اُٹھ کھڑا ہُوا اور لہو کی دھار پھوٹ نکلی۔ سائیکل ڈگمگا کر گر پڑی اور پّے کی کی ہیڈل پر سے ہو کر زمین پر آ رہا۔

ہر چند بیوہ نے چیخ ماری تھی اور بوڑھے نے امداد طلب نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا تھا مگر حادثہ اتنی سادہ نوعیت کا تھا کہ انہیں پّے کی کے شدید طور پر مجروح ہونے کا گمان تک نہ ہوا۔ جب وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچے اور اس کا سر گود میں رکھ کر دیکھنے لگے تو پتہ چلا کہ معاملہ کس قدر سنگین ہے وہ بول تک نہ سکتا تھا۔ انہوں نے اس کے چہرے سے لہو پونچھا اور مایوسی کے عالم میں اس فاصلے کو جانچنے لگے جو اسے اٹھائے ہوئے انہیں طے کرنا تھا۔ اگر چہ بڑھیا کا مکان چند ہی گزوں کے فاصلے پر تھا مگر اس کی دہلیز الانگنے سے پیشتر ہی پّے کی دم توڑ چکا تھا!

دروازے کے باہر لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ بڑھیا چلاّ چلاّ کر ان سے کہنے لگی۔ ''ارے لوگو! خدا کے لیے کچھ کرو! ابھی بگڑا ہی کیا ہے۔ یونہی اسے ذرا نقاہت سی ہو گئی ہے۔'' ایک نوجوان مزدور کو دروازے سے دھکیلتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بھاگیو، دوڑیو، جلدی سے ڈاکٹر کو بلا لائیو کہ وہ اسے ہوش میں لے آئے گا۔''

لاش چارپائی پر سیدھا لٹا دی گئی تھی اور اس کے چہرے کا گرد و غبار، زندگی کی پریشانی کی آخری یادگار بن کر رہ گیا تھا۔ ہمایوں کے کانوں میں موت کی خبر پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ چاروں جانب سے تیزی کے ساتھ آنے شروع ہو گئے۔

ہر ایک یکے بعد دیگرے لاش کو دیکھتے ہی سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے احتراماً گھٹنوں کے بل جھک جاتا اور آنکھوں کے سامنے دل زوگی کی تصویر سی کھنچ جاتی۔ جب ان کی حرکات و سکنات سے بیوہ کو یقین ہو گیا کہ پّے کی کی واقعی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے تو اس نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر آہ و بکا سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ عورتوں کے لیے اسے قابو میں رکھنا سخت مشکل ہو گیا۔ وہ بار بار اٹھ کر دوڑنا چاہتی تھی تا کہ ڈربے میں جا کر ایک ایک مرغی کی گردن مروڑ ڈالے۔ وہ بین کر کر کہتی ''ہائے میرے لال! میں دنیا جہاں کی

مرغیوں کو تیر سر پر سے صدقے کر دوں۔ میں ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گی۔ اب مجھے ان سے کام ہی کیا ہے۔ ہائے لوگو! میں لٹ گئی! کیا کل عالم کی مرغیوں کی قیمت انسانی خون کے ایک قطرے سے سوا تھی۔ اور اس بڈھی کھوسٹ مرغی کی قیمت ہو گی بھی کتنی؟ یہی کوئی چھ شلنگ! اور لوگو! میرے لال زندگی کی قیمت چھ شلنگ اٹھی کیا؟ ہائے رے میں مر گئی۔ میرے لال! میں لٹ گئی!''

تھوڑے دیر کے بعد اس نے فریاد بند کر دی اور ایک ایک کا منہ تکنے لگی۔ ''ہوتا کیا جو اس کی سائیکل اس مرغی پر چڑھ دوڑتی؟ ہائے! ہائے! اس نے کیوں چھ شلنگ کی مرغی کو بچانے کی کوشش کی؟ ہائے میرے لال! کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ تو اپنی میّا کے لیے اس کھوسٹ مرغی سے ہزار گنا قیمتی تھا جے آج نہیں تو کل ذبح ہونا ہی تھا! ہائے تو نے کیا کر ڈالا میرے لال؟ ہائے میں نصیبوں جلی تجھے کہاں سے لاؤں۔ جب تو دنیا کی اس ذلیل ترین پہاڑی سے اتر رہا تھا رتو تو نے بریکوں کو کیوں اس زور سے دبایا کہ وہ تیری ہی موت کا پیغام بن گئیں؟ ارے مر گئی میں! ہائے تجھ کہاں سے لاؤں میرے لال!''

تعزیت کرنے والے اس کے بازوں کو تھپکتے اور از راہ تسلّی کہتے ''بس بس اللہ تجھے صبر دے بی بی! صبر سے کام لو۔ خدا کو یہی منظور تھا، اب صبر کرو صبر۔ وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ اس کے سوا انہیں اور کوئی کلمۂ تسلی سوجھتا ہی نہیں تھا۔

سالہا سال گزرنے پر بھی بڑھیا کے لبوں پر ایک ہی سوال رہا جسے کہتے وہ تھکتی نہیں تھی۔ شام کے وقت جب کوئی ملاقاتی ایک آدھ گھنٹہ کے لئے اس کے پاس آجاتا تو وہ جیسے از خود اس ایک سوال کو دہرانے پر مجبور سی ہو جاتی۔ ''میرے لال نے کیوں مرغی کی زندگی کو اپنی زندگی سے عزیز تر سمجھا؟ کیوں؟ ہائے میرے لال تو نے مجھے زندہ ہی مار ڈالا۔ ہائے میں مر گئی!'' اور سالہا سال گزرنے پر بھی ملنے والوں کے لبوں پر ایک ہی جواب رہا ''بس بس! اللہ تجھے صبر دے بی بی صبر سے کام لو، خدا کو یہی منظور تھا۔ اب صبر کرو صبر۔''

پھر دونو چپ چاپ بیٹھے ہوئے آگ کو گھورتے رہتے!

لیکن چند ہمسائے ایسے بھی ضرور ہوں گے جنہیں رہ رہ کر خیال آتا ہوگا کہ اگر آپے کی ذرا دل کڑا کر کے اپنی سائیکل کے پہیے تلے اس جان لیوا مرغی کو کچل ڈالتا تو پھر کیا ہوتا؟ اور یقیناً وہ آگ کو گھورتے ہوئے اپنے تصور کے زور سے حادثے کے وقوع کا نقشہ یوں کھینچ سکتے ہیں کہ تفصیلات کے تھوڑے سے

تغیر وتبدل کے بعد کہانی ایک اور ہی انجام سے ہمکنار کر دیں۔ یہ لوگ پے کی کو بھی اچھی طرح جانتے بو جھتے تھے اور اس کی ماں کو بھی اور جب آپ لوگوں کو اچھی طرح جانتے بوجھتے ہوں تو آپ کی نظر میں ان کے ذہن کی پیچیدگیاں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور آپ محض یہی نہیں کہ اس حادثے کہ جزئیات کو پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہوں جو انہیں ایک خاص قسم کے حالات کے ماتحت پیش آئی تھیں بلکہ ان کے اس قول و فعل کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جو کسی اور نوع کے حادثے کے گزرنے پر ان سے سرزد ہو سکتا ہے اور حقیقت یہ کہ اختراع سے کام لین ابات کو من و من درستی کے ساتھ یاد رکھنے سے آسان ہوتا ہے اور اگر یونہ ہوتو تخلیقی آرٹ کی دو شاخیں بے ثمر ہو کر رہ جاتیں۔ (1) افسانہ گوئی اور (2) خوش گپئی۔

اگر پے کی کھوسٹ مرغی کو کچل ڈالتا تو پھر کیا ہوتا؟ اس موضوع کے متعلق میں جو تاثرات کروں تو تو قع ہے کہ آپ مجھے متہم قرار نہ دیں گے کہ میں نے مصنفہ ہونے کی رعایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ بہرکیف یہ بھی تو اسی افسانے کا ایک ٹکڑا ہے جسے میں پہلے عرض کر چکی ہوں اور اگر پہلے بھی آپ نے نوازش فرمائی تھی تو اب بھی مجھے امید ہے کہ اسی کرمفرمائی کے لیے بار گراں ثابت نہ ہوں گی اور آپ دیکھیں گے کہ اپنی جزئیات کے لحاظ سے یہ نیا افسانہ، پہلے افسانے سے جو آپ پڑھ چکے ہیں۔ زیادہ مختلف نہیں ہے اور تو اور پیرائہ آغاز تک وہی ہے یعنی۔

بیوہ کی گائے سڑک کنارے گھاس چرنے میں مصروف ہے اور وہ خود کاندھے پر گوبھی کی بھاری بوری اٹھائے اٹھائے چار میل لمبی راہ کو طے کر کے قصبے میں پہنچتی ہے اور اس طرح جو چند پیسے اسے مل جاتے ہیں انہیں پے کی کی تعلیم پر خرچ کرتی ہے۔ صبح اگر سکول سے لیٹ ہونے کا ذرا سا شبہ بھی ہوتا ہے تو ایک ہنگامہ بپا کر دیتی ہے اور شام کو بار الماری پر رکھی ہوئی فرسودہ گھڑی کو دیکھتی ہے کہ کب وہ وقت ہو جب پے کی پہاڑی کی چوٹی پر گھر کو لوٹتا نظر آئے۔

پھر جون کے گرم دن کو ایک محنت کشا بوڑھا سڑک پر دکھائی دیتا ہے اور بڑھیا کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر دو باتیں کرنے کے لئے رُک جاتا ہے۔ کچھ کہنے سے پہلے دیوار کے پتھروں میں اُگی ہوئی گھاس کے تنکے کو اکھاڑ کر منہ میں چبانا شروع کر دیتا ہے اور جب بات کرنے کو منہ کھولتا ہے تو وہی الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ ''پے کی کا انتظار کر رہی ہو!'' اور ٹوپی اتار کر رومال سے پیشانی کے پسینے کو پونچھ ڈالتا ہے۔ یہ تو آپ کو یاد ہوگا نا کہ یہ آدمی ضعیف العمر تھا اور گرمی کی حدّت کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرتے ہوئے کہتا

ہے۔''غضب کی گرمی ہے بہن!''

بیوہ نے پہاڑی کی طرف بیتابانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا''گرمی نے تو قیامت ڈھا رکھی ہے بھائی! اورخصوصاً جب ادھر سورج کی شعاعیں ہینڈل پر ہزاروں کرنیں پیدا کر کے آنکھوں کے لیے عذاب بن رہی ہوں اور اُدھر راہ کی دھول اٹھ اٹھ کر گلے کو پکڑ رہی ہو تو اس عالم میں چار میل سائیکل کی سواری کچھ معنیٰ رکھتی ہے۔''

''اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ گرمی اچھی ہے یا بارش، تو میں وہیں کہہ اٹھوں گا گرمی!''

''تم نے ٹھیک کہا۔کئی بار تو بارش کا پانی ٹپے کی کے کپڑوں میں یوں یوں جذب ہو جاتا تھا کہ جب وہ گھر پہنچ کر انہیں اتارتا تو وہ لکڑی کے تختے کی طرح اکڑے ہوتے تھے اور دیوار کے ساتھ لگے یوں لٹک رہے ہوتے تھے کہ دنیا دیکھے تو کہے۔ ٹپے کی انہیں پہنے کھڑا ہے۔

''واقعی؟ پھر تو اسے خوب شاباش ملتی ہوگی اندنوں حق بات تو یہ ہے کہ اس سا کوئی ہی ہوگا مائی کا لال؟ بھولا بھالا اور پیارا سا بچہ!''

''بڑھیا نے متنفر آمیز لہجے میں کہا''ٹپے کی کی بات کر رہے ہو؟ تو سن لو کہ اس کی پیدائش کے روز سے آج تک ایک بار بھی میں نے عمداً اسے شاباش نہیں دی۔ میں نے شروع سے عزم کر رکھا تھا کہ میں ٹپے کی کو یوں پروان چڑھاؤں گی کہ نرم دلی اور رقیق القلبی جیسی بیماریاں اسے چھونے نہ پائیں۔''

بیوہ نے پہاڑی کی جانب نگاہ کی اور پھاٹک سے باہر آ کر کنکریاں اڑانا شروع کر دیں۔اس کے انہماک کا یہ عالم تھا گویا سڑک پر اسے اور کوئی کام نہیں تھا۔تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر چوٹی کی طرف دیکھا۔''وہ رہا ٹپے کی۔''اور یہ کہتے ہی جیلی سے گردوغبار کا وہ طوفان اٹھا دیا کہ ٹپے کی کی نیلی جرسی کی جھلک اور سائیکل کے پہیوں کی تاروں کی چمک بمشکل دکھائی دے رہی تھی۔ ٹپے کی بے پناہ رفتار کے ساتھ نشیب کی طرف آ رہا تھا اور جوں جوں قریب آ رہا تھا رفتار اور بھی تیز ہو رہی تھی۔ وہ ماں کو ہوا میں ہاتھ لہرا لہرا کر خوش آمدید کہہ رہا تھا اور مرغیوں کو راہ سے ہٹانے کی خاطر ان پر زور زور سے آوازے کس رہا تھا۔

مرغیاں بے حد خوفزدہ تھیں اور گردنیں بڑھا بڑھا کر کھائیوں کی طرف دوڑی جاتی تھیں اور جب آخری مرغی نے زور کی کٹ کٹاک کے ساتھ کھائی کی راہ لی تو چند ثانیوں کے لیے پہیّوں کی چکراتی گھومتی، چمکتی تاروں کے سامنے راستہ صاف ہو گیا۔

اور پھر سان نہ گمان گویا غیب سے کڑکڑاتی اور پھڑ پھڑاتی مرغی طرفۃ العین میں دیوار پر آنازل ہوئی اور دوسرے ہی لمحے زمین پر بسنے والے پرندوں کی سی بھدی پرواز کے ساتھ فضا میں اٹھ گئی۔ پّپے کی نے سیٹی بند کر دی۔ بیوہ نے ایک سخت چیخ ماری پّپے کی چلا اٹھا اور بیوہ نے اپنے اپیرن کے دامن کو ہوا میں پھٹپھٹانا شروع کر دیا۔ پھر پّپے کی کی سائیکل ڈگمگائی اور بریک لگنے پر پہیّوں نے دھول کے بادل فضا میں لہرا دیئے۔

معاملہ ایک منٹ کے اندر اندر وقوع پذیر ہو کر یوں برق رفتاری سے ختم ہو گیا کہ دماغ کو اس کی نوعیت کے متعلق سوچنے سمجھنے کی مہلت تک نہ مل سکی۔ پّپے کی نے پاؤں کو زمین پر ٹکایا و را سے زمین کے ساتھ گھسیٹتے گھسیٹتے سائیکل کے پہیوں کے زور کو مدہم کیا اور پھر اسے یک دم روکنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے سائیکل کو ہاتھوں کی گرفت سے فوراً آزاد کر دیا۔ وہ دھڑام سے سڑک پر آ رہی اور وہ خود پیچھے کو بھاگ اٹھا۔ بیوہ کی آنکھیں نظارے کی تاب نہ لا سکیں اور اس نے ذہنی فرار کے لئے اپیرن کو سر پر ڈال لیا۔

''اس نے جیتی جاگتی مرغی کو مار ڈالا ہے۔ فنا کر دیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپیرن کو سر سے ہٹایا، اور آپ دوڑ کر پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ بوڑھے نے گھاس کے تنکے کو منہ سے تھوک ڈالا جسے وہ ابھی تک چبا رہا تھا اور اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

''اسے مار ڈالا ہے اسے تو نے؟'' یہ کہتے ہوئے جب وہ جائے وقوع پر پہنچی اور بکھرے ہوئے پروں اور خون کے چھینٹوں پر اس کی نظر جو پڑی تو مارے غصے کے جھلا اٹھی۔ اس نے ہاتھ کو سر سے بلند کر کے مٹھی کو اس زور سے بھینچا کہ ہاتھ کے جوڑ تک سفید پڑ گئے پّپے کی ڈر کے مارے مرغی کی لاش پر جھک گیا اور یوں کُبڑا ہو گیا جیسے وہ اپنے آپ کو کسی کاری ضرب سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی ٹانگیں خون کے دھبوں سے داغدار تھیں اور مردہ مرغی کے سفید اور بھورے پر اس کے ہاتھوں اور کپڑوں سے چپکے ہوئے تھے اور ساری سڑک پر پھیلے پڑے تھے بہت سے پیٹ کے نرم اور سفید پَر ابھی تک ہوا کے جھکّڑ میں چکر کھا رہے تھے۔

''میرے بس کی بات نہیں تھی ماں! میں سچ کہتا ہوں کہ یہ مجھے اس وقت نظر آئی جب اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔''

بڑھیا نے مرغی کو سینے کی ہڈی سے پکڑا اور اس کی لٹکتی ہوئی گردن سمیت اسے ہر پہلو سے بغور دیکھنا

سروع کر دیا۔ پھر دفعتاً ٹانگ سے پکڑ کر اپنے سر سے بلند کیا اور خون میں لت پت مرغی کو تابڑ توڑ لڑکے کی پیٹھ پر مارنے لگ پڑی۔ لہو کے اڑتے چھینٹوں نے اس کے چہرے، ہاتھ، کپڑے اور سڑک کی سفید رنگ مٹی کو لالہ زار کر دیا۔

وہ مارتی جاتی تھی اور ہانپ ہانپ کر کہہ رہی تھی ''میرے سامنے تمہیں جھوٹ بکنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ تمہیں مرغی نظر آئی تھی اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں نظر آئی تھی۔ اور جب تم نے اسے دیکھا تو موقع محل سے اس قدر بوکھلا گئے کہ سیٹی بند کر دی اور چلّا اٹھے۔ ہم تجھے بھی بغور دیکھ رہے تھے اور وقوعہ پر بھی ہماری کڑی نظر تھی۔'' اور بوڑھے کی طرف مڑ کر تقاضا طلب لہجے میں کہنے لگی۔'' کیوں میں صحیح بات ہی کہہ رہی ہوں نا کہ اس نے مرغی کو بالضرور دیکھا تھا۔ دیکھا تھا نا؟''

''بات تو کچھ ایسی نظر آئی تھی۔'' بوڑھے کی نظر مرغی پر تھی جو بڑھیا کے ہاتھ میں لٹک رہی تھی اور کہنے کے انداز میں تیقن نام کو نہ تھا۔

''ٹھیک نکلی نا میری بات!'' اس نے مرغی کو سڑک پر دے مارا جس طرح اب مرغی تمہیں نظر آ رہی ہے، جب بھی نظر آئی تھی مگر وہ تو کہو گھر پہنچ کر پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کی تمہیں اس قدر پڑی تھی کہ تم نے اسے بچانے کی پرواہ تک نہ کی۔ تھی نا یہی بات؟''

''تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے ماں! حقیقت یہ ہے کہ میں نے دیکھا اسے ضرور تھا مگر اس وقت جب بات میرے بس کی نہیں رہی تھی۔''

شور وغل سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ بڑھیا نے ان پر فاتحانہ نظر ڈالی اور سر ہلا ہلا کر بولی'' دیکھا تم نے، اب اعتراف کر رہا ہے کہ مرغی کو دیکھا تھا اس نے۔''

''اور میں نے انکار کب کیا تھا اس بات کا ماں؟'' اسکے طرزِ تخاطب میں اپیل کا رنگ جھلک رہا تھا اور وہ لوگوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس معاملے کے جج مقرر ہوئے ہیں۔

بیوہ نے چلّا کر کہا'' سنا آپ لوگوں نے؟ کس ڈھٹائی سے کہہ رہا ہے کہ اس نے اس بات کا انکار ہی کب کیا تھا۔ یعنی دوسرے لفظوں میں دنیا جہاں کے سامنے اسے اعتراف ہے کہ اس نے مرغی کو اپنے چہرے کی ناک کی طرح واضح اور صاف دیکھا تھا اور اس لئے دیکھا تھا کہ حضور بصد شانِ استغناء اسے پیّے تلے کچل ڈالیں۔''

''اور تمہی بتاؤ ماں! مجھ سے ہو بھی کیا سکتا تھا اس وقت!'' اسنے بے چارگی کے عالم میں بازو ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ وہ کبھی لوگوں کو دیکھتا تھا اور کبھی ماں کو، ملتجیانہ نگاہوں سے۔ ''تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں کس قدر تیز رفتاری کے ساتھ نشیب کی طرف رواں تھا اگر ایسے میں میں بریکیں لگا دیتا تو یقیناً ہینڈل پر سے لڑھک کر سیدھا سر کے بل سڑک پر آ رہتا!'' ''تو اس سے تمہارا کیا بگڑ جاتا بھلا؟ یاد ہے جب'' اس کے بعد خمی میک سے کُشتی لڑئے تھے تو کیا حالت ہوتی تھی تمہاری کہنیوں اور گھٹنوں کی ان گنت خراشوں سے لہولہان! ۔اور حضرت کا چہرہ سوج کر چولھے جیسا ہو جاتا تھا اور اس کے باوجود کیا مجال جو ایک حرف شکایت بھی زبان پر آیا ہو۔'' پھر لوگوں کی طرف مڑ کر کہتی ''اگر خدا کو حاضر ناظر جانتے ہو تو یہ باتیں بھی سچ سمجھنا۔ اور کئی بار تو یوں وہ کہ گھر میں آ رہا ہے اور ناک سے خون کی تلیں ں بہہ رہی ہیں۔ ایک آنکھ اس زور سے بن پڑی ہے اور مردے کی آنکھ بھی کیا بند ہوگی۔ پولٹس باندھ باندھ کر اور پٹیاں نچوڑ نچوڑ کر سو مشکلوں سے چہرے مہرے کی حالت سدھرتی اور اس مشقت سے مجھ بڑھیا کے ہاتھ سات سات دن انیٹھے رہتے!'' اب جو گھوم کر مڑی تو پے کی سے مخاطب تھی ''جب درختوں پر چڑھتے ہو تو کبھی گرنے سے خوف کھایا تم نے؟ اور یہ جو بلّیوں کے پیچھے لپک کر چھت پر جا دھمکتے ہو تو ڈرے بھی کبھی گرنے سے؟ ارے، اب میں سمجھی تمہارا کیا مطلب تھا اس حرکت سے! تم نے عمداً اس مرغی کو موت کے گھاٹ اتارا کیوں اتارا ہے اسے موت کے گھاٹ؟ لو میں بتاؤں تمہیں! تم پڑھنے سے اُکتا گئے تھے۔ اور اب کالج جانے سے بھی گھبرا رہے تھے۔ اس لئے تم نے سوچا کہ اگر ان چند مرغیوں کو ختم کر دوں تو پڑھائی کے خرچ اخراجات کے لئے نقد کا یہ جو ایک ذریعہ بنا ہوا ہے ختم ہو جائے گا۔ پھر نہ ہوگا بانس اور نہ بنے گی بانسری۔ کیوں جناب یہی تھی نا بات؟''

پے کی کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ''اے ماں، اگر سکول میں داخلہ کے لینے فوراً بعد میں اس قسم کے ہتھکنڈوں سے کام لیتا تو کوئی بات بھی تھی۔ اب جبکہ میں خاصا پڑھ لکھ چکا ہوں اور بفضلِ خدا کالج میں جانے کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ اب بھلا ایسی مہمل کارستانیوں سے فائدہ! میں جو گولی کی طرح اڑا چلا آ رہا تھا۔ تو معلوم ہے کیوں؟ اس لئے کہ میں تمہیں یہ بتانے کے لیے بے تاب تھا کہ مجھے وظیفہ مل گیا ہے میں ہوسٹل سے نکلا ہی تھی کہ استاد نے مجھے وظیفے کی خوشخبری سنائی اور میں مارے خوشی کے تم تک چشم زون میں پہنچنا چاہتا تھا۔ تو یہ تھی بات جو میں زور زور سے پیڈل گھما رہا۔ سیٹی بجا رہا اور ہاتھ

لہرا رہا تھا اور جب پہاڑی کی چوٹی سے مَیں نے تمہیں دیکھا تو میں نے پوری قوت سے فضا میں اپنا باز ولہرا دیا،تم نے یقیناً دیکھ تو لیا ہوگا باز کو فضا میں لہراتے!''

یہ سننا تھا کہ بڑھیا کے ہاتھوں میں سکت نہ رہی اور وہ اس کے دونوں پہلوؤں میں لٹک سے گئے! جو الفاظ اس کے منہ میں تھے وہ منہ ہی میں رہ گئے۔اس پر شکست خوردگی اور سکتے کی کیفیت طاری تھی۔اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کہے تو کیا کہے۔اس کا دل جیسے کہہ رہا تھا۔''دیکھ! تجھے ہمسائے کس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تک رہے ہیں!'' وہ چاہ رہی تھی کہ لوگ دفع دفان ہو جائیں تو وہ ان کی عدم موجودگی میں اپنے بیٹے کی گردن میں باہیں ڈال دے۔اسے کھینچ کر اپنی آغوش میں لے آئے اور اسے ننھے بچے کی طرح سینے سے لگا لے! لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لوگ سر ہلا ہلا کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے۔دبی دبی ہنسی سے اس کی اس حرکت کا مذاق اڑائیں گے۔وہ لاکھ برخوردار اور لائق نائق سہی مگر ان لوگوں کے سامنے اس بات کا اظہار تو ان کی دِلی مراد بر لانے کے مترادف ہوگا۔اور اگر وہ اپنے ان جذبات کو جو اس وقت اس کے سینے میں کروٹیں لے رہے تھے، بر ملا ظاہر کر دے تو وہ یہی سمجھیں گے کہ ماں بیٹے کے وظیفہ پانے کے لئے بے قرار تھی،اور اسی مقصد کی خاطر گنِ گنِ کر دن کاٹ رہی تھی! وہ ان سے تمنا پوری کرنے سے رہی! بیوہ نے ٹھان لی تھی کہ اس سے کبھی کوئی حرکت سرزونہ ہونے پائے گی۔جس سے لوگوں کو بغلیں بجانے کا موقع ملے۔

پے کی اس کے سامنے کھڑا تھا۔مردہ مرغی کے خون کے چھینٹوں اور منتشر پروں نے اس کے جسم کو پوری طرح ملوث کر رکھا تھا۔بیوہ کو بچے کی یہ ہیئت کذائی ایک آنکھ نہ بھائی۔وہ اسے مغموم وملول دیکھ کر خود بھی محزوں و مایوس سی ہوگئی۔مگر یہ خیال اسے کھائے جا رہا تھا کہ آخر کیوں اس نے آج ہی کے عظیم دن میں مرغی کچل کر اپنی کامیابی کی خوشخبری کی مسرت تباہ و برباد کر ڈالی ہے! اس کا ذہن پریشان خیالی میں مبتلا تھا۔پے کی کے چہرے پر خون کے دھبے نمایاں تھے انہیں دیکھتے ہوئے وہ دل میں کہنے لگی۔''آج ہی اس کے مستقبل کا شاندار آغاز تھا ور آج ہی لہو نے اپنا منحوس سایہ اس پر ڈال دیا۔مایوسی،خوف،کبیدگی اور سرکشی سے اس کی حالت چیخنے چلانے والے جانوروں کی طرح ہوگئی تھی۔اس نے اپنی نظر کو پے کی کے چہرے سے ہٹا کر لوگوں پر مرتکز کر دیا''وظیفہ،وظیفہ!'' وہ زہر خند انداز میں چلائی اس کی آواز اور لب و لہجے میں طعن وتضحیک کے نشتر پوشیدہ تھے،''وظیفہ کیا لے آئے،سرخاب کے پر

لگ گئے تمہیں یہی سمجھتے ہوگے کہ اب تم کسی کے محتاج نہیں رہے۔ بڑے آدمی بن گئے ہو اور آزادانہ جو جی چاہے کر سکتے ہو اور یہ جو بڑھیا ماں ہے تمہاری۔ ارے وہی جس نے انڈے اور سبزیاں بیچ بیچ کر خون پسینہ ایک کر کے پائی پائی جوڑ جوڑ کر تمہاری خدمت کی ہے، اسے نظر تحقیر دیکھتے ہوگے، کیوں نہیں صاحب !وظیفہ خوار جو ہو گئے ہو تم! تمہاری بلا سے، مرغیاں جئیں یا مریں، اگر یہی بھوت سوار ہے تمہارے سر پر تو سن لو کان کھول کر میری بات! مانا وظیفے کی رقم سے تم کتابیں بھی خرید لو گے اور فیسیں بھی ادا کر دو گے مگر کپڑے کہاں سے لاؤ گے تم؟ دیکھا! یہ تھی وہ چیز جو تم نے نظرانداز کر رکھی تھی اور بندی نے یاد دلا دی! کیوں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں کچھ؟'' وہ کولھوں پر ہاتھ ٹیک کر مٹک رہی تھی اور ٹپے کی کی سر نہوڑائے کھڑا تھا، اسے اب آس پاس کے ہونق لوگوں کی استمداد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ البتہ اسے اپنی مختصر سی زندگی میں اتنا پتہ ضرور چل گیا تھا کہ مار پیٹ سے تو خود کو بچایا جا سکتا ہے مگر شرم و ندامت کی مار سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

بڑھیا کا دل آتش غم میں پہلے ہی جل رہا تھا۔ بچے کے چہرے پر شرمندگی کے آثار دیکھ کر کباب ہو گیا۔ مگر مزاج کی شعلہ افشانی کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ اپنے التہاب میں خود ہی نہ جل بُجھتی تو اس پر قابو پانا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ گرج کر کہنے لگی ''کون لے کے دے گا۔ تمہیں سوٹ اور بوٹ؟'' یہ کہہ کر ذرا سی دیر کے لیے چپ ہو گئی اور اس توقف میں اس نے اور کلیجہ چھلنی کر دینے والے تحقیر آمیز الزامات تراشنے کی بابت سوچنا شروع کر دیا۔ ''اور کون لے کر دے گا تمہیں برجس؟'' وہ پھر خاموش ہو گئی۔ اس کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ ''مزید کون سا بہتان تلوار کی کاٹ کی طرح اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ اور کس ندامت کے بوجھ تلے یہ پس کر رہ جائے گا؟''

''ارے ہاں، کون لے کر دے گا تمہیں شب خوابی کا لباس یا ننگے ہی سور ہو گے ان سب کے بغیر؟''

اس پر ہمسایوں کے قہقہے بلند ہوئے اور اس کے ذہنی تشنج کو آسودگی سی مل گئی بڑھیا خود بھی ہنس پڑی اور ہنسی کے مارے اس کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ ایسے میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر ایک چیز نے ایک نیا اور سادہ مفہوم اختیار کر لیا ہے اور معاملے کی چند منٹ پیشتر بھیانک شکل اب کچھ ایسی بھیانک نہیں رہی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ ٹپے کی بھی ان قہقہوں میں شریک ہو جائے لیکن جب اس نے اسے گم سم دیکھا تو ایک عجیب طرح کے خوف نے اس کے دل کو افسردہ و منجمد کر ڈالا۔

''چلو گھر میں چلو۔'' وہ اسے اپنے آگے آگے دھکیل رہی تھی۔ وہ خون کے ان دھبوں سے نظریں بچانا چاہتی تھی۔ خون جو سڑک پر جم گیا تھا۔ وہ گھور گھور کر تکنے والے مجمع کی نگاہوں سے بچے کی کو چھپالینا چاہتی تھی اسے اس ہجوم سے سخت نفرت ہوگئی تھی ۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ اگر یہ گروہ وہاں موجود نہ ہوتا تو صورت حال قطعی مختلف ہوتی !وہ چاہتی تھی کہ بچے کی کا پسندیدہ بھرتہ آلوؤں کا کیک بنا کر اسے کھلائے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یوں بچے کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

لیکن جب ماں نے دسترخوان پر کھان چنا تو اس نے ماں کے بے حد اصرار وسماجت کے باوجود صرف دو تین لقمے زہر مار کر کے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے بعد بچے کی نے مَل مَل کر نہانا شروع کیا لیکن انتہا کی رگڑ ارگڑی کے باوجود خون کے دھبے جسم کے بعض حصوں پر باقی رہ گئے ۔ کانوں کے پیچھے، انگلیوں کے ناخنوں کے نیچے، اور کلائی کے قریب۔

''اب بیٹے! بڑھیا کپڑے پہنیو!'' بیوہ نے کہا اگر چہ وہ بہت خلیق وحلیم بننے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کے لب ولہجہ میں درشتی اور الجھاؤ آچکا تھا۔ اس کی عنائتیں بھی تلخ وناگوار معلوم تھیں ۔ بچہ کرسی پر منہ بسورے بیٹھا تھا۔ اور اس کی سرومہری بڑھیا کے لئے از حد پریشان کن تھی ۔ کیونکہ اس سے اس کے دل میں برہمی ومحبت کی ایک اور آویزش شروع ہوگئی تھی ۔ اسے بچے کی کی بے رخی اور برافروختگی قطعاً ناپسند تھی ۔ وہ چاہتی تھی کہ بیٹا ماں سے اتنا ہی کہہ دو کہ ''ماں، میں باہر آؤں گا۔'' مگر جب کبھی وہ کھلے دروازے کی طرف نظریں اٹھاتا تو اسے بے چینی سی محسوس ہوتی اس لیے کہ وہ بچے کی کو محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ اپنی چھت تلے، اندرون در، اپنی نظروں کے سامنے!

جب دوسرے روز وہ بچے کی کے کمرے میں اسے سکول جانے کے لیے جگانے آئی تو کمرہ سونا پڑا تھا۔ بستر کی سلوٹیں کہہ رہی تھیں کہ پچھلی رات اس پر کوئی نہیں سویا۔ وہ بھاگی بھاگی صحن میں آئی اور ہر کہیں نام لے لے کر آوازیں دینے لگی ۔ مگر جواب ندارد! اوپر، تلے ہر جگہ دوڑی بھاگی لیکن اس کا نام نشان نہ پایا۔ ہمسایوں کے گھروں میں ڈھونڈا مگر بے سود جب وہ ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں داخل ہوتی تھی تو اسے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اس کے پیچھے دبی دبی ہنسی سے اس کا مذاق اڑا رہا ہے ۔ اس کا وجود نہ گاؤں میں تھا نہ شہر میں! اس کے سکول کے استاد نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ ''بہتر ہوگا جو تم پولیس کو اس کے حلیئے سے آگاہ کر دو! اس جیسا حساس بچہ میں نے شاید ہی کبھی دیکھا ہو بعض دفعہ اس کے دماغ

میں ایسے ایسے خیال در آتے تھے کہ الٰہی توبہ!''

اس رات اس کا اتا پتا لگانے میں پولیس کی انتہائی کوششیں رائیگاں گئیں لیکن چند روز بعد بڑھیا کے نام خط آیا جس میں اس کی خیر عافیت لکھی تھی۔ اسی خط میں اس نے لکھا تھا۔'' مہربانی کر کے ماسٹر جی سے میرا سلام کہئے اور کہئے کہ میں اب سکول کو لوٹنے کا ارادہ ترک کر چکا ہوں اور اگر وہ چاہیں تو میرا وظیفہ شوق سے کسی اور لڑکے کو دیدیں۔ اور ماں! میں جب بھی پیسے کمانے کے قابل ہوا تو سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ تمہیں تمہاری مرغی کی قیمت بھیج دوں!''

کئی ہفتے گزرنے پر ایک اور خط آیا،'' ماں! مجھے ٹرالر پر کام مل گیا ہے اور امید ہے کہ تنخواہ کی ہفتہ داری بچت سے کچھ نہ کچھ رقم جمع ہو جائے گی۔ اور جب میں بندرگاہ میں آؤں گا تو پس اندوختہ تمہیں بھیج دوں گا۔ اگرچہ میں خط کتابت کے تسلسل کو قائم نہ رکھ سکوں گا۔ مگر میری کوشش یہی ہوگی کہ تمہارے تمام احسانات کا بدلہ چکا دوں۔'' اس خط میں اس کا پتہ تحریر نہیں تھا۔ اور روپیہ بھیجنے کا وعدہ نبھانے پر بھی اس نے اپنا پتہ چھپائے رکھا۔ وقتاً فوقتاً جو خط بھیجتا تھا۔ اس سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہے۔

پھر راتوں کو جب لوگ بڑھیا کے پاس آتے تھے اور آگ کے پاس بیٹھے ہوئے اس کے شکایت آمیز فقرے کو سنتے تھے۔ جسے وہ بار بار دہراتی تھی کہ،'' آخر اس نے اپنی زندگی کی قیمت مرغی کی قیمت سے کم تر کیوں سمجھی؟'' اگر ان لمحوں میں ان کا رخش خیال کہیں کا کہیں پہنچ جائے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہوگئی، ممکن ہے کہ ان کا تخیل، کہانی کے جس دوسرے رخ کو پیش کرتا ہو، اس میں حقیقت کی جھلک زیادہ برملا اور موثر ہو۔ کیونکہ ہمارے تمام افعال و اعمال کے تانے بانے کے دو ہی پہلو تو ہوتے ہیں۔ اور کیا یہ غلط ہے ہم نہایت ہشداری اور کمال خلوص نیت کے ساتھ ان راہوں کے طے کرتے ہیں جو ہمارا مقدر ہو چکی ہیں۔ اگر ایسا کرتے ہوئے ہم کسی المیہ سے دوچار ہوا جائیں تو بہر کیف وہ حزینہ امیں المیہ سے تو بہتر ہی رہے گا جو ہماری وجہ سے ہوا۔ کیا یہ غلط ہے؟۔

سیلاب

لوشون

(1)

یہ وہ زمانہ تھا جب ''سیلاب عظیم نے تباہی مچا رکھی تھی اور تمام کوہ و پر بت اس کے گھیرے میں تھے۔''[1] شہنشاہ شون کی ساری رعایا کو ٹیلوں اور اونچی جگہوں پر پناہ نہ مل سکی لہٰذا کچھ درختوں پر چڑھ گئے اور بعضوں نے لٹھوں کے ٹھاٹ باندھ کر اوپر تختوں کے سائبان بنا لئے۔ پہاڑی چوٹیوں سے یہ منظر بڑا شاعرانہ لگتا تھا۔

ٹھاٹوں پر سوار لوگ دور دراز سے سیلاب کی تباہ کاریوں کی خبریں لا رہے تھے۔ اور آخر کار ہر کوئی جان گیا کہ نواب کون ☆[2] جو نو سال کی کوششوں کے بعد بھی سیلاب کا سد باب کرنے میں ناکام رہا تھا، شاہی عتاب کا نشانہ بن گیا تھا اور اسے ''کوہ پنکھ'' پر دیس نکالا دے دیا گیا تھا۔ اس کا بیٹا نواب ون مینگ جس کی عرفیت آہ یوی[3] تھی، اس کا جانشین مقرر ہوا تھا۔

دھرتی پر ہر سو پانی ہی پانی تھا۔ تمام چھوٹی بڑی دانشگاہیں بند ہو گئی تھیں۔ بچوں کے مکتبوں کے لئے بھی کہیں جگہ نہ ملتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عام لوگ پراگندہ ذہن ہو گئے اور بہت سے عالم ''کوہ ثقافت''[4] پر جمع ہو گئے تھے ان کیلئے کھانا چونکہ 'روزگار کاریگروں کی مملکت' سے اڑن رتھوں میں آتا تھا، اس لئے انہیں کوئی فکر فاقہ نہ تھا اور وہ پڑھنے پڑھانے میں مگن رہتے تھے۔ مگر ان میں سے زیادہ تر لوگ یوی کے مخالف اور بعض تو اس کے وجود ہی پر معترض تھے۔

مہینے میں ایک بار فضا میں گھوں گھوں کا شور پیدا ہوتا اور پھر اڑن رتھ نمودار ہو جاتا۔ اس کے جھنڈے پر بنے ہوئے سنہری دائرے سے مدہم سی روشنی پھوٹتی رہتی تھی۔ زمین سے پانچ فٹ کی بلندی پر چند ٹوکریاں لٹکی ہوتیں۔ ان ٹوکریوں میں کیا ہوتا تھا، عالموں کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ رتھوں کے سواروں اور نیچے والوں میں کچھ یوں بات چیت ہوتی تھی:

''گڈ مورننگ!''[5]

''ھاؤ ڈو یو ڈو؟''

''گلو... گلی...''

''او۔ کے!''

اڑن رتھ ''یگانہ روزگار کاریگروں کی مملکت'' کولوٹ جاتا تو فضا میں چہار سو خاموشی چھا جاتی اور عالموں کو بھی چپ سی لگ جاتی، پھر وہ کھانے میں لگ جاتے اور صرف پہاڑوں سے ٹکراتی لہروں کا شور سنائی دیتا۔ پھر کچھ دیر ستانے کے بعد عالموں کی توانائیاں لوٹ آتیں اور علمی گفتگو کے ہنگامے میں لہروں کا شور بھی دب کر رہ جاتا۔

''یوی بھلے ہی کون کا بیٹا ہو، مگر سیلاب پر کبھی قابو نہ پا سکے گا،'' ایک عالم نے جس کے ہاتھ میں چھڑی تھی، اعلان کیا، ''میں نے بہت سے بادشاہوں، نوابوں اور امراء کے شجرے اکٹھے کئے ہیں۔ طویل عرصے تک بغور مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں: امیروں کی اولاد امیر ہی رہتی ہے اس بدمعاشوں کے بچے بدمعاش بنتے ہیں ___ یہ کیفیت ''موروثی'' ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کون کامیاب رہتا تو یوی کو بھی کامیابی نصیب ہوتی، احمقوں کی اولاد دانا نہیں ہو سکتی!''

''او۔کے!'' ایک اور عالم نے جس کے ہاتھ میں چھڑی نہیں تھی، اس کی بات سے اتفاق کیا۔

''مگر جہاں پناہ کے والد کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ایک اور بے چھڑی کے عالم نے دخل در معقولات کیا۔

''وہ ممکن ہے کچھ 'ضدی' رہے ہوں، لیکن بعد میں ٹھیک ہو گئے۔ حقیقی احمق کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے...''

''او۔کے!''

''یہ ...یہ ...سس ...سب ...بب...بکواس ہے!'' ایک عالم نے جس کی ناک سرخ ہو رہی تھی، ہکلاتے ہوئے کہا، ''تم افواہوں سے گمراہ ہو چکے ہو، حقیقت تو یہ ہے کہ یوی نام کا کوئی شخص ہی موجود نہیں۔ یوی ایک رینگنے والا کیڑا ہے۔ کوئی رینگنے والا کیڑا کیا سیلاب کا سدباب کر سکتا ہے؟ دراصل کون کا بھی کوئی وجود نہیں، کون ایک مچھلی ہے۔ کیا مم ...مچھلی ....سس...سیلاب پر قق ...قق ....قابو پا سکتی ہے؟'' اس نے دونوں پاؤں بری طرح پٹختے ہوئے کہا۔

''کون کے وجود پر شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ سات سال قبل میں نے اسے بچشم خود دیکھا تھا۔ جب وہ کوہ کھون لون پر آلوچے کی کلیوں سے لطف اندوز ہونے جا رہا تھا۔''

''ممکن ہے آپ نام سے دھوکا کھا گئے ہوں۔ اسے کون کی بجائے 'آدمی' کہہ کر پکارنا زیادہ مناسب

ہے۔ جہاں تک یوی کا تعلق ہے، تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک رینگنے والا کیڑا ہے۔ میرے پاس اس کے عدم وجود کے یہ متعدد ثبوت موجود ہیں۔ آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ...''

وہ بڑے طنطنے کے ساتھ اٹھا، چاقو نکال کر پانچ صنوبر کے درختوں کی چھال اتار لی۔ پھر روٹی کے بچے کھچے ٹکڑوں کو پانی میں ڈال کر لئی بنائی۔ اس میں لکڑی کا کوئلہ ملایا اور چھوٹے چھوٹے حروف میں درختوں پر لکھنا شروع کر دیا تا کہ یوی کے عدم وجود کا ثبوت رہے۔ نو تیا ستائیس۔ پورے ستائیس دن وہ لکھتا رہا۔ جو کوئی اس کا یہ مقالہ پڑھنا چاہتا، اسے فیس میں ایلم کے دس رسیلے پتے، یا اگر وہ لٹھوں کے ٹھاٹ کا مکین ہوتا تو سیپ بھر کائی دینی پڑتی تھی۔

ہر سو پانی ہی تھا، لہٰذا شکار یا کا شتکاری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سیلاب سے بچ نکلنے والوں کے پاس وقت کی کمی نہ تھی، اس لئے بہت سے لوگ پڑھنے چلے آئے۔ تین دن تک صنوبروں کے گرد لوگوں کا ہجوم رہا اور اِدھر اُدھر تھکاوٹ کی آہیں اور ستائشی کلمات سنائی دیتے رہے۔ تاہم چوتھے روز ٹھیک دوپہر کے وقت جب عالم تلے ہوئے نوڈل کھا رہا تھا، ایک کسان ٹپک پڑا۔

یوی نام کے آدمی موجود ہیں اور یوی کا مطلب 'رینگنے والا کیڑا' نہیں ہوتا۔ ہمارے دیہات میں بن مانس کیلئے لفظ 'یوی' لکھنے کا رواج ہے۔''

''کیا ایسے آدمی بھی ہیں جنہیں بن مانس کہا جاتا ہو.....'' عالم چنگھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور اسی عالم میں نوڈلوں کا ادھ چبا نوالہ نگل گیا۔ اس کی ناک قرمزی ہو گئی تھی۔

''یقیناً ہیں۔ میں تو ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کے نام کتا اور بلی ہیں!''

''مسٹر پرندے کا سر، اس سے بحث نہ کریں۔'' چھڑی والے عالم نے بیچ میں کودتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی روٹی رکھ دی تھی، ''تمام دیہاتی گنوار ہوتے ہیں، اپنا شجرہ لے کر آؤ!'' اس نے دیہاتی کو مخاطب کیا، ''میں ثابت کر دوں گا کہ تمہارے پرکھے سب کے سب گنوار تھے...''

''میرے پاس کوئی شجرہ وجرہ نہیں...''

''اوہنہ!'' یہ تم جیسے جاہل اور بے ہودہ لوگ ہی ہیں جن کی وجہ سے میری تحقیق میں صحت پیدا نہیں ہوتی!''

''لیکن اس کے لئے آپ کو کسی شجرے کی ضرورت نہیں۔ میری تھیوری غلط نہیں ہو سکتی۔'' مسٹر

پرندے کا سر نے اور زیادہ آگ بگولا ہوتے ہوئے کہا۔'' بہت سے عالموں نے مجھے لکھا ہے کہ وہ اس تھیوری کی تائید کرتے ہیں۔ میرے پاس وہ سب خطوط یہاں موجود ہیں...''

''نہیں، نہیں، ہمیں بہر طور اس کا شجرہ دیکھنا ہوگا...''

''مگر میرے پاس تو شجرہ ہے ہی نہیں۔'' وہ ''گنوار'' کہنے لگا، ''اور مصیبت کے اس وقت جب کہ چاروں طرف سے رابطہ کٹا ہوا ہے، آپ کے دوستوں کے تائیدی خطوط سے ثبوت مہیا کرنا، گھونگے کے خول میں بیٹھ کر عبادت کرنے سے زیادہ مشکل ہوگا۔ ثبوت یہاں ہمارے سامنے موجود ہے۔ آپ کا نام مسٹر پرندے کا سر ہے۔ کیا آپ آدمی کی بجائے واقعی پرندے کا سر ہیں؟''

''لعنتی!'' مسٹر پرندے کا سر کا منہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ ''تمہیں میری توہین کرنے کی جرأت کیسے ہوئی! تمہارا خیال ہے کہ میں آدمی نہیں ہوں! چلو، نواب کاؤیاؤ کے پاس چل کر از روئے قانون اس کا تصفیہ کرائے لیتے ہیں! اگر میں آدمی ثابت نہ ہوا تو بخوشی سزائے موت قبول کرلوں گا۔ مطلب یہ کہ اپنا سر کٹوا دوں گا۔ سمجھے؟ اگر یہ بات غلط نکلی تو تم سزا پاؤ گے۔ بس ذرا انتظار کرلو۔ میں اپنے نوڈل ختم کر لوں۔''

''جناب،'' دیہاتی نے احمقانہ انداز سے کہا، ''آپ ایک عالم فاضل شخص ہیں۔ اتنا تو جانتے ہوں گے کہ دوپہر ہو چکی ہے اور دوسروں کو بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔ مصیبت تو یہ ہے کہ داناؤں کی مانند گنواروں کا بھی پیٹ ہوتا ہے ___ انہیں بھی بھوک لگتی ہے۔ معاف کیجئے گا، میں اب کائی تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ آپ دعویٰ دائر کر دیں۔ میں عدالت میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنے ٹھاٹ پر چڑھا اور جال لے کر آبی بوٹیوں کی تلاش میں نکل گیا۔ ایک ایک کر کے تماشائی بھی اِدھر اُدھر ہو گئے اور لال ناک اور کانوں والا مسٹر پرندے کا سرا کیلا رہ گیا۔ وہ پھر سے نوڈلوں پر ٹوٹ پڑا اور چھڑی والا عالم سر ہلانے لگا۔

مگر یہ اہم سوال تصفیہ طلب رہ گیا تھا کہ یوی واقعتاً کوئی رینگنے والا کیڑا تھا یا آدمی؟

(2)

یوں لگتا تھا کہ یوی رینگنے والا کیڑا ہی تھا۔

آدھے سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ''یگانہ روزگار کاریگروں کی مملکت'' سے اڑن رتھ آٹھ بار آ چکا تھا۔ ٹھاٹوں کے مکین جو صنوبروں پر لکھا مقالہ پڑھنے آئے تھے، ان میں ہر دس میں سے نو جلندر کی بیماری کا شکار ہو چکے تھے۔ مگر ابھی تک یہ خبر نہ آئی تھی کہ سیلاب پر قابو پانے کا فرض کس افسر کو سونپا گیا تھا۔ اڑن رتھ دسویں بار آیا تب کہیں پتہ چلا کہ یوی نام کا ایک شخص واقعی موجود تھا، وہ واقعی کون کا بیٹا تھا اور اسے شاہی حکم کے تحت تحفظ آب کا وزیر مقرر کیا گیا تھا، وہ تین سال قبل چی چو سے روانہ ہو گیا تھا اور اب کسی بھی وقت واپس آنے والا تھا۔

لوگوں میں قدرے ہلچل پیدا ہوئی مگر وہ پرسکون اور مشکوک سے تھے۔ وہ اتنی افواہیں سن چکے تھے کہ اب ایسی ہر بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتے تھے۔

تاہم، اب کی بار خبر کسی حد تک معتبر لگتی تھی۔ دو ہفتے نہ گزرے ہوں گے کہ ہر کسی کی زبان پر ایک ہی ذکر تھا کہ وزیر جلد ہی پہنچنے والا ہے، کیونکہ ایک شخص نے جو دور کہیں آبی بوٹیاں اکٹھی کر رہا تھا، سرکاری کشتیاں دیکھی تھیں۔ اس نے ثبوت کے طور پر اپنے سر کا نیلا اور سیاہ گومڑا بھی دکھایا جو بقول اس کے ایک محافظ کا پتھر لگنے سے ابھر آیا تھا، کیونکہ وہ بعجلت راستے سے نہ ہٹ سکا تھا۔ یہ وزیر کی آمد کا ایک ٹھوس ثبوت تھا۔ اور وہ شخص دیکھتے ہی دیکھتے شہرت حاصل کر گیا اور بہت مصروف رہنے لگا۔ ہر کوئی اس کا گومڑا دیکھنے لپکا چلا آیا اور اس کے ٹھاٹ پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ تب عالموں نے اسے طلب کیا اور سنجیدہ تحقیق کے بعد فیصلہ دیا کہ اس کا گومڑا اصلی گومڑا تھا۔ یہ دیکھ کر مسٹر پرندے کا سر اپنی تھیوری سے دستکش ہو گیا اور تاریخی تحقیق کا کام دوسروں پر چھوڑ کر لوک کہانیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

گومڑے والے واقعہ سے کوئی بیس دن بعد بڑی بڑی کشتیوں کا ایک بیڑا نمودار ہوا جس کی ہر کشتی درخت کے سالم تنے سے بنائی گئی تھی۔ ہر کشتی پر بیس محافظ چپو چلا رہے تھے اور تیس نیزے لئے کھڑے تھے۔ ہر کشتی کے اگلے اور پچھلے حصے پر جھنڈے لہرا رہے تھے۔ جونہی کشتیوں کا بیڑا پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا، وہاں مقیم شرفاء اور علماء نے پورے احترام سے اس کا خیر مقدم کیا۔ کچھ دیر بعد، سب سے بڑی کشتی سے دو ادھیڑ عمر کے افسر اترے، جنہیں شیر کی کھالوں میں ملبوس دس بارہ محافظوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ دونوں افسر خیر مقدم کرنے والوں کے جلو میں، چوٹی پر بنی ہوئی پتھروں کی عمارت میں چلے گئے۔

خشکی اور تری پر لوگ گردنیں نکال نکال کر سن گن لینے کی کوشش کرنے لگے۔ اور آخر ان پر عقدہ کھل

گیا کہ وہ دونوں سرکاری انسپکٹر تھے۔ یوی بذات خود نہیں آیا تھا۔

عہدیدار کمرے کے وسط میں بیٹھ گئے اور کچھ کھانے پینے کے بعد تحقیقات شروع کر دی۔

''جہاں پناہ، حالات اتنے ناگفتہ بہ نہیں ہیں۔ کھانے پینے کو کافی مل جاتا ہے۔'' میاؤ بولی کے ایک ماہر نے عالموں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا، ''روٹی مہینے میں ایک بار گرائی جاتی ہے اور مچھلی کی کمی نہیں جو اگرچہ کیچڑ کا ذائقہ دیتی ہے، مگر خاصی موٹی تازی ہوتی ہے۔ اور جہاں تک عوام کا تعلق ہے، ان کے لئے ایلم کے پتوں اور آبی بوٹیوں کی کمی نہیں۔ وہ مغز کھپائی کئے بغیر دن بھر چرتے رہتے ہیں ___ دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ انہیں چونکہ دماغی کام نہیں کرنا ہوتا، اس لئے ان کے لئے یہ چیزیں کافی ہیں۔ ہم نے ان کا کھانا چکھا ہے اور وہ کچھ ایسا برا نہیں، اس کا ذائقہ ایک مخصوص قسم کا ہے...''

''مزید برآں،'' ایک اور عالم جو شہنشاہ شن نونگ کی ''مخزن الادویہ'' [8] پر سند تھا، بیچ میں بول پڑا، ''ایلم کے پتوں میں وٹامن ڈبلیو اور آبی بوٹیوں میں آیوڈین ہوتی ہے جو خنازیر کے لئے تیر بہدف ہے اور یہ دونوں چیزیں غذائیت سے بھرپور ہیں۔''

''او۔ کے!'' ایک اور عالم نے کہا اور افسر حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''اور پینے کا پانی تو اس کثرت سے ہے کہ دس ہزار نسلوں کے لئے بھی کافی ہوگا۔'' مخزن الادویہ کے ماہر نے بات جاری رکھی، ''لیکن بدقسمتی سے یہ کچھ گدلا ہے اور پینے سے پہلے اسے نتھارنا ضروری ہے۔ لیکن میرے بار بار کہنے کے باوجود لوگ اس قدر کوڑھ مغز ہیں کہ دھیان ہی نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ کہ بیمار پڑنے والوں کا کوئی شمار نہیں...''

''کیا سیلاب کی ذمہ داری بھی انہی پر عاید نہیں ہوتی؟'' گہرے بھورے رنگ کے لمبے چوغے میں ملبوس ایک معزز نے جس کی داڑھی میں پانچ نوکیں بنی ہوئی تھیں، اظہار خیال کیا، ''یہ لوگ سیلاب آنے سے پہلے اس قدر کام چور تھے کہ پشتوں کی مرمت تک نہ کی اور جب سیلاب آ گیا تو پانی کی نکاسی میں سستی دکھائی...''

''اسے روحانی اقدار سے عاری ہونا کہتے ہیں،'' نوکدار مونچھوں والے ایک مقالہ نویس نے رائے دی جو فوشی [9] کے اسلوب میں نثر لکھتا تھا، اور پچھلی صف میں بیٹھا ہوا تھا۔ ''جب میں کوہ پامیر پر چڑھا تو بہشتی ہوائیں چل رہی تھیں، آلوچے کے پھول کھل رہے تھے، آسمان پر سفید ابر پارے مچل رہے تھے،

دھوپ کی پیلاہٹ تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی، چوہے سو رہے تھے، میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ اپنے ہونٹوں میں سگار دبائے ہوئے تھا اور اس کے چہرے پر چھپی یو۱ کا نقاب تھا... ہاہاہا! اب اس سلسلے میں کوئی چارہ کار نہیں...''

''او۔ کے!''

اس قسم کی گفتگو گھنٹوں جاری رہی۔ افسروں نے توجہ سے ساری باتیں سننے کے بعد کہا کہ وہ ایک مشترکہ رپورٹ تیار کریں جس میں بحالی سے متعلق تفصیلی تجاویز بھی ہوں۔ اس کے بعد وہ کشتی میں واپس چلے گئے۔

اگلے دن، سفر کی تھکن کے بہانے انہوں نے نہ کوئی کام کیا اور نہ ہی کسی سے ملاقات کی۔ تیسرے روز عالموں نے انہیں پہاڑ کی چوٹی پر چھتری نما بوڑھا صنوبر دیکھنے کی دعوت دی۔ سہ پہر کو وہ پہاڑ کے عقب میں زرد بام مچھلی کا شکار کھیلنے چلے گئے اور شام تک شکار سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ چوتھے دن انہوں نے اس بہانے نہ کوئی کام کیا اور نہ ہی کسی سے ملاقات کی کہ وہ معائنے کے بعد تھک گئے تھے۔ پانچویں دن دوپہر کے بعد انہوں نے عوام کے نمائندے کو بلا بھیجا۔

عوام چار دن پہلے ہی سے اپنا نمائندہ چننے کی تگ ودو میں لگے ہوئے تھے، مگر کوئی یہ ذمہ داری قبول کرنے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ انہیں افسروں سے ملاقات کا کوئی تجربہ نہیں۔ اور آخر کار قرعہ فال گومڑے والے کے نام نکلا اور اسے بھاری اکثریت سے چن لیا گیا۔ وجہ یہ کہ وہ افسروں سے ملاقات کا کچھ تجربہ رکھتا تھا۔ یہ فیصلہ سنتے ہی اس آدمی کے گومڑے میں جو بیٹھ چکا تھا، یوں ٹیسیں اٹھنے لگیں جیسے کوئی سوئیاں چبھو رہا ہو۔ اس نے آبدیدہ ہو کر التجا کی، ''نمائندہ بننے سے تو مر جانا بہتر ہے۔'' اب لوگ دن رات اس کے گرد جمع رہنے لگے اور بار بار یہی زور دیتے کہ وہ اپنی اخلاقی ذمہ داری پوری کرے۔ انہوں نے اس پر عوامی مفادات سے پہلوتہی کا الزام لگایا اور کہا کہ وہ ایک ایسا خودغرض ہے جسے چین میں رہنے کو کوئی حق نہیں۔ زیادہ جوشیلے لوگ مکے تان تان کر اسی کو سیلاب کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ آخر لاچار ہو کر اس نے فیصلہ کیا کہ دوسروں کی بھلائی کے لئے خود کو قربان کر دینا ٹھاٹ پر جان دینے سے بہتر ہوگا۔ چوتھے روز اس نے از حد اولوالعزمی دکھائی اور رضامند ہو گیا۔

ہجوم اسے داد و تحسین دینے لگا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ لوگ حسد کی آگ میں جلنے لگے۔

پانچویں دن لوگ اسے کھینچ کھانچ کر کنارے تک لے گئے جہاں اسے بلاوے کا انتظار کرنا تھا۔اور افسروں نے واقعی اسے بلا بھیجا۔اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں،مگر اس نے ایک بار پھر اولوالعزمی دکھائی۔اس نے دو بھرپور جماہیاں لیں اور سوجی آنکھوں کے ساتھ سرکاری کشتی میں یوں سوار ہو گیا جیسے دھرتی چھوڑ کر اچانک فضا میں اڑنے لگا ہو۔

یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت ناچ اٹھی کہ نیزہ بردار محافظوں یا شیر کی کھالوں میں ملبوس سپاہیوں نے اسے مارا پیٹا نہ گالیاں دیں_ وہ چلتا ہوا سیدھا وسطی کیبن میں پہنچ گیا۔فرش پر ریچھوں اور چیتوں کی کھالیں بچھی تھیں،دیواروں پر کمانیں اور تیر آویزاں تھے،اور ہر طرف آرائشی ظروف سجے ہوئے تھے۔اور یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ گئے۔پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا دیا اور دیکھا کہ سامنے اعزازی نشستوں پر دو افسر براجمان تھے۔اسے نظر بھر کر انہیں دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

''تم عوام کے نمائندے ہو؟'' ایک افسر نے پوچھا۔

''جی،انہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔'' اس کی نظریں فرش پر بچھی چیتے کی کھال کی چتیوں پر گڑی ہوئی تھیں۔

''تمہارے ہاں صورت حال کیسی ہے؟''

سوال اس کے پلے نہ پڑا اور وہ چپ سادھے رہا۔

''سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے؟''

''جی حضور،آپ کی نوازش سے...'' اس نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد مزید کہا،''ہم گزر کر رہے ہیں ...وقت گزر رہا ہے...''

''تم لوگ کھاتے کیا ہو؟''

''پتے،آبی بوٹیاں...''

''کیا تم یہ چیزیں ہضم کر لیتے ہو؟''

''بالکل جناب،ہم ہر چیز کھانے کے عادی ہیں ہم ہر چیز کھا لیتے ہیں۔صرف کچھ نوجوان سرپھروں نے ان چیزوں کے بارے میں ایک گانا گھڑ رکھا ہے اور ناچ بھی۔لوگوں کے دلوں میں بدی جڑ پکڑتی جا رہی ہے!مگر ہم انہیں خوب لتاڑتے ہیں!''

افسر ہنسنے لگے اور ایک نے دوسرے سے کہا، ''یہ بڑا ایماندار آدمی ہے!''

تعریف سن کر وہ پھول گیا اور ہمت جو بڑھی تو بے تکان بولنے لگا:

''ہم ہمیشہ کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے ہیں۔ آبی بوٹیوں سے رسیلا زمردیں شوربا بناتے ہیں، اور ایلم کے پتوں سے شاہی پکوان۔ ہم درختوں سے ساری چھال نہیں اتارتے، کچھ چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اگلے موسم بہار میں ٹہنیوں پر نئے پتے پھوٹ نکلیں اور ہم چن لیں۔ کاش، آپ عالی مرتبت صاحبان کی اجازت سے ہم بام مچھلی پکڑ سکتے...''

دونوں افسروں کی دلچسپی معدوم ہو چکی تھی۔ ایک افسر نے یکے بعد دیگرے دو زوردار جماہیاں لیں اور سخت لہجے میں کہا، ''ایک مشترکہ رپورٹ تیار کرو جس میں بحالی کے لئے تفصیلی تجاویز درج ہوں۔''

''مگر جناب ہم میں سے کوئی بھی لکھنا نہیں جانتا!'' اس نے دبے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا تم سب لوگ ان پڑھ ہو؟ یہ تو سخت پسماندگی کی نشانی ہے! اگر یہ بات ہے تو اپنے کھانوں کے نمونے لے کر آؤ!''

وہ خوف اور خوشی کے ملے جلے احساسات لئے باہر آ گیا اور اپنا گومڑا سہلاتے ہوئے فوراً اپنے افسروں کا حکم خشکی، درختوں اور ٹھاٹوں کے مکینوں تک پہنچایا اور ساتھ ہی بلند آواز سے حکم دیا، ''یہ نمونے اعلیٰ افسروں کے لئے ہیں، اس لئے ہر شے صاف ستھری اور احتیاط سے پکائی جانی چاہیئے...''

عوام پتے دھونے، چھال اتارنے اور آبی بوٹیاں اکٹھی کرنے میں جت گئے۔ ہر طرف گہما گہمی اور افراتفری کا سماں تھا۔ خود گومڑے والے شخص نے نمونے لے جانے والی قاب تیار کرنے کے لئے رندے سے لکڑی ہموار کی۔ پھر دو تختیوں کو پالش کر کے خوب خوب چمکایا اور تیزی سے پہاڑ کی چوٹی پر عالموں کے پاس لے گیا، اور درخواست کی کہ ان پر خطاطی کریں۔ وہ قاب کے ڈھکنے پر ''پہاڑ سی درازی عمر اور سمندر ایسی گہری مسرت'' لکھوانا چاہتا تھا۔ دوسری تختی پر جو اس نے یہ اعزاز ملنے کی خوشی میں اپنے ٹھاٹ پر لوح نصب کرنے کی خاطر بنائی تھی، وہ لکھوانا چاہتا تھا، ''ایماندار شخص کا مسکن''، لیکن عالم صرف پہلی تختی پر ہی لکھنے پر راضی ہوئے۔

(3)

جب یہ دونوں افسر دارالحکومت لوٹے تو بیشتر دیگر انسپکٹر بھی ایک ایک کر کے واپس آ چکے تھے۔

صرف یوی ابھی نہیں لوٹا تھا۔ وہ چند دن گھر میں آرام کرتے رہے اور پھر محکمہ تحفظ آب میں ان کے ساتھیوں نے ان کی واپسی کی خوشی میں زبردست دعوت کا اہتمام کیا۔ اس دعوت کے لئے چندہ تین زمروں میں منقسم تھا۔ مسرت، دولت اور درازی عمر۔ اور کم سے کم چندہ پچاس بڑی کوڑیاں[11] مقرر کیا گیا۔ اس روز عمدہ گھوڑوں اور بگھیوں کا ایک شاندار نظارہ دیکھنے میں آیا اور شام ہوتے ہوتے سارے مہمان آ گئے۔ صحن میں مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ خدام گائے کے گوشت کے پتیلے لا رہے تھے اور اس کی اشتہا انگیز مہک سے ان کے منہ میں پانی بھر آ رہا تھا۔ جب تین بار شراب کا دور چل چکا تو افسران سیلاب زدہ علاقوں کے مناظر بیان کرنے لگے جن کا وہ دورہ کر کے آئے تھے۔ نرسلوں کی سفید براق کلغیاں، سونے کی طرح جھلملاتا گدلا پانی، موٹی تازی رسیلی بام مچھلیاں، ملائم آبی بوٹیاں... نشہ بڑھا تو انہوں نے کھانوں کے وہ نمونے نکالے جو وہ اکٹھے کر کے لائے تھے۔ یہ نمونے چوبی قابوں میں بند تھے جن پر فوشی اور چھانگ چی[12] کے ''سسکتے بھوت'' حروف کے اسلوب میں تحریریں رقم تھیں۔ ابتدا میں تو ہر کسی نے تحریروں کی تعریف کی اور پھر اتنا جھگڑا ہوا کہ نوبت مار کٹائی تک آ گئی۔ آخر میں انہوں نے اس تحریر کو بہترین قرار دیا، ''ریاست خوشحال ہے، عوام امن چین سے زندگی بسر کرتے ہیں۔'' کیونکہ نہ صرف خطاطی قدیم فن کا شاہکار تھی بلکہ اس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا وہ بھی بڑے صائب تھے۔ شاہی مورخوں کے ہاتھوں رقم کئے جانے کے لائق!

چین کے اس مخصوص فن کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے ثقافتی مسائل ایک طرف رکھے اور قابوں میں محفوظ نمونوں پر گفتگو شروع کر دی۔ خوبصورت وضع کے کیک دیکھ کر ہر کسی نے تعریف کی۔ مگر، شاید وہ بہت زیادہ شراب پی چکے تھے، اس لئے قضیہ کھڑا ہو گیا۔ ایک نے صنوبر کی چھال کے کیک کا لقمہ لیا تو اس تازگی اور مہک کے قصیدے پڑھنے لگا اور اعلان کر دیا کہ وہ اگلے دن ہی استعفیٰ دے کر سبکدوشی کی زندگی شروع کر دے گا اور حقیقی مسرتوں کے لطف اٹھائے گا۔ ایک اور شخص نے سرو کے پتوں کی روٹی کھائی تو اسے سخت اور بدذائقہ قرار دیا۔ اس کی زبان چھل گئی تھی۔ اور عوام کے دکھ درد میں شرکت کے اس اظہار سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حکمرانی کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا اور وزیر بن کر ذمہ داریاں سنبھالنا بھی کوئی آسان بات نہ تھی۔ دوسرے لوگ کیک اور روٹیاں جھپٹنے کو لپکے، کیونکہ تھوڑی دیر بعد چندہ اکٹھا کرنے کے لئے ان چیزوں کی نمائش ہونے والی تھی۔ ادھ کھائے کیکوں اور روٹیوں کی نمائش مناسب نہ تھی۔

دریں اثنا باہر شور وغوغے کا سماں پیدا ہو چکا تھا۔ سانولے چہروں اور بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس بدوضع، گداگروں ایسے لوگوں کا ایک ہجوم ساری رکاوٹیں توڑ کر اندر آ گیا تو سنتریوں نے چمکتے نیزے دکھا کر انہیں روک لیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟_ آنکھیں کھول کر دیکھو!'' ہجوم کے آگے آگے چلنے والے ایک دراز قد چھریرے بدن والے شخص نے جو دم بھر کے لئے مبہوت سا ہو کر رہ گیا تھا، چلا کر کہا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے تھے۔

محافظوں نے مدہم روشنی میں غور سے دیکھا، پھر بڑے احترام سے راستہ چھوڑ دیا، اور تن کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے بہر حال پیچھے آنے والی ایک تھکی ماندی عورت کو روک لیا جو کھدر کا چوغہ پہنے ہوئے تھی اور اس کی بغل میں ایک بچہ تھا۔

''ارے! تم مجھے نہیں پہچانتے؟'' اس نے بند مٹھی سے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے متحیر لہجے میں پوچھا۔

''یقیناً پہچانتے ہیں بیگم یوی!''

''تو پھر مجھے اندر کیوں نہیں جانے دیتے؟''

''مادام، بڑا مشکل وقت آن پڑا ہے۔ اس سال عوام کا اخلاق سدھارنے اور مردوں کے دلوں میں صالح خیالات پیدا کرنے کے لئے مردوں اور عورتوں کو یکجا ہونے کی اجازت نہیں۔ اب عدالت میں کوئی عورت داخل نہیں ہو سکتی۔ یہ قاعدہ یہاں صرف آپ ہی کے لئے نہیں ہے۔ یہ حکم اوپر سے آیا ہے۔ ہم قصوروار نہیں ہیں۔''

وہ لمحہ بھر کو تو گھبرائی، مگر پھر مڑ کر بلند آواز سے کوسنے لگی:

''خدا کرے تمہارے ٹکڑے اڑیں! تم کس کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے بھاگے بھاگے اندر گئے ہو؟ اپنے گھر کے سامنے سے یوں گزر گئے جیسے تمہارے ماں باپ مر چکے ہوں! تم افسر ہو، افسر! اس افسری کا کیا فائدہ؟ یاد رکھو کہ تمہارے باپ کو کس طرح دیس نکالا ملا اور وہ جھیل میں کود کر کچھوا بن گیا! سنگدل خبیث، خدا کرے تمہاری بوٹیاں چیل کوے کھائیں!...''

اسی اثنا میں ہال کے اندر ایک ہلچل مچ چکی تھی۔ دعوت اڑانے والوں نے جو کرخت چہروں والے

لوگوں کے انبوہ کو اندر آتے دیکھا تو بھاگ نکلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن جب کسی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نظر نہ آیا تو ہمت کر کے غور سے آنے والوں کا جائزہ لینے لگے۔ آگے آگے آنے والے شخص کا چہرہ گوسنولایا ہوا اور دبلا پتلا تھا، تاہم لوگ اس کے رکھ رکھاؤ سے جان گئے کہ وہ یوی تھا۔ باقی لوگ ظاہر ہے اس کے ساتھی تھے۔

اس اچانک حملے سے ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔ چوغوں کی سرسراہٹ اور پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی اور وہ سب اپنی نشستوں سے ہٹ گئے۔ یوی سیدھا میز کی طرف بڑھا اور اعزازی نشست سنبھال لی۔ اس کے مزاج میں شائستگی نہ تھی یا پھر وہ گنٹھیا کا مریض تھا، کیونکہ ٹانگیں جوڑ کر بیٹھنے کی بجائے اس نے ٹانگیں پھیلا رکھی تھیں اور اس کے بڑے بڑے پاؤں کا رخ افسروں کی طرف تھا۔ پاؤں میں موزے نہیں تھے اور تلوؤں پر سنگھاڑے ایسے گھٹے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھیوں نے اس کے دونوں جانب نشستیں سنبھال لیں۔

''حضور کیا آج ہی دارالحکومت پہنچے ہیں؟'' ایک افسر نے جو دوسروں سے قدرے زیادہ باہمت تھا، گھٹنوں کے بل آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''سب لوگ یہاں قریب آ کر بیٹھو!'' یوی نے سوال نظر انداز کرتے ہوئے چنگھاڑ کر کہا، ''تم لوگوں کی تحقیقات کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟''

افسروں نے گھٹنوں کے بل آگے بڑھتے ہوئے پریشان نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چچوڑی ہوئی ہڈیوں اور ادھر اُدھر بکھرے ہوئے بچے کھانوں کے پاس بیٹھ گئے۔ گھبراہٹ میں انہیں یہ ہمت بھی نہ ہوئی کہ خادموں سے کہہ کر جگہ صاف کروا دیتے۔

''حضور کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ حالات اتنے برے نہیں ہیں۔ ہمارے رائے میں حالات خاصے اچھے ہیں۔'' آخر ایک افسر نے کہنا شروع کیا، ''صنوبر کی چھال اور آبی بوٹیوں کی بہتات ہے، اور پینے کے پانی کی بھی کمی نہیں۔ عام لوگ نیک دل اور سادہ لوگ ہیں اور وہ اس زندگی کے عادی ہیں۔ حضور جانتے ہی ہوں گے کہ ان کی قوت برداشت کا ساری دنیا میں شہرہ ہے۔''

''اس ناچیز نے چندہ اکٹھا کرنے کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔'' دوسرا افسر بول اٹھا، ''ہماری تجویز ہے کہ انوکھے کھانوں کی ایک نمائش منعقد کی جائے۔ اور ملبوسات کی نمائش کے لئے مس نوی وی کو مدعو کیا

جائے۔اس کے لئے ٹکٹ فروخت کئے جائیں گے،تاہم،زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آنے پر راغب کرنے کی غرض سے ہم یہ اعلان کریں کہ نمائش میں کوئی چندہ نہیں مانگا جائے گا۔''

''بہت خوب۔''یوی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''بہر حال،ایک فوری اہمیت کا کام یہ ہے کہ عالموں کو اونچی جگہ لانے کے لئے ٹھاٹوں کا ایک بڑا بیڑا بھیجا جائے گا۔''تیسرا افسر بول اٹھا،''اس کے علاوہ'یگانہ روزگار کاریگروں کی مملکت،میں ایک ایلچی بھیجا جائے،انہیں بتایا جائے کہ ہم ثقافت کو عزیز جانتے ہیں اور یہ کہ وہ امدادی سامان ہر ماہ یہاں بھیجتے رہیں عالموں نے ہمیں بڑی اچھی رپورٹ دی ہے جس میں اس امر کی توثیق کی گئی ہے کہ ثقافت قوم کیلئے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے اور عالم ثقافت کی روح ہوتے ہیں۔ثقافت موجود رہے گی تو چین بھی قائم رہے گا۔باقی سب باتیں ثانوی ہیں...''

''ان کے خیال میں چین کی آبادی حد سے زیادہ ہے۔''پہلا افسر پھر گویا ہوا،''آبادی میں کمی حصول امن کا بہترین طریقہ ہے۔[۱۳]عام لوگ احمق ہوتے ہیں۔ان کے رنج وراحت،دکھ اور خوشیاں کسی صورت بھی داناؤں کے تخیلات ایسی نازک نہیں ہوتیں۔انسان کو جاننے اور واقعات کا اندازہ لگانے کے لئے موضوعیت پسندی شرط اول ہوتی ہے۔مثال کے طور پر شکسپیئر کو لیں...''

بکواس!یوی نے سوچا اور پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔''میری تحقیقات کے مطابق بند باندھنے کا پرانا طریقہ خاصا غلط تھا۔آئندہ ہمیں آب نکاسی کا طریقہ اپنانا چاہیے۔آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟

ہال میں قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی!افسروں کے چہروں پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔کئی ایسے تھے جن کی طبیعت خراب ہوگئی_اور اگلے روز رخصت علالت پر جانے کا سوچنے لگے۔

''یہ طریقہ چھی یو نے اپنایا تھا!''ایک نوجوان افسر نے قدرے ہمت سے کام لیتے ہوئے غصے میں اپنے آپ سے کہا۔

''میری حقیر رائے میں تو حضور یہ خیال ترک کر دیں!''

سفید سر اور داڑھی والے ایک افسر نے کہا۔اسے یہ زعم تھا کہ سلطنت کے مستقبل کا دارومدار اب اس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے چند لفظوں پر تھا۔چنانچہ حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے اس نے صدائے احتجاج بلند کر دی،''بند باندھنے کا یہ طریقہ آپ کے محترم آنجہانی والد نے اپنایا تھا۔سعادت مند بیٹا وہی ہوتا ہے جو

تین سال تک باپ کی روایت نہ بدلے۔[۱۴] آپ کے والد کو فوت ہوئے ابھی تین سال پورے نہیں ہوئے ہیں۔''

یوی نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اور یہ بھی تو سوچیں کہ آپ کے آنجہانی والد نے کس قدر مصائب اٹھائے!'' کھچڑی سر اور داڑھی والے ایک افسر نے جو یوی کے ماموں کا منہ بولا بیٹا تھا، دخل دیتے ہوئے کہا، ''انہوں نے طغیانی کے راستے میں بند باندھنے کے لئے آسمانی شہنشاہ سے شی ژانگ[۱۵] مستعار لی۔ اور گوان پر شاہی عتاب نازل ہوا، مگر پانی کی سطح قدرے نیچی ہوگئی۔ میری رائے میں ہمیں ان کے طریقے پر کاربند رہنا چاہیئے۔''

یوی چپ سادھے بیٹھا رہا۔

''حضور، آپ کو وہ کام پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہیے جو آپ کے والد ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔'' ایک موٹے افسر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ یوی کی خاموشی دیکھ کر اس نے یہی خیال کیا کہ وہ قائل ہونے کو تھا۔ پھر بھی اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے، ''خاندان کا نام پرانے خاندانی رسم و رواج کے ذریعے روشن کریں۔ حضور شاید نہیں جانتے کہ لوگ آپ کے محترم آنجہانی والد کے بارے میں کیا کچھ کہتے رہتے ہیں...''

''قصہ مختصر یہ کہ بند باندھنے کا طریقہ دنیا بھر میں کامیاب رہا ہے۔'' سفید داڑھی والا افسر اپنے ساتھی کی لغزش پر جلدی سے پردہ ڈالنے کے لئے بیچ میں ٹپک پڑا، ''تمام دوسرے طریقے 'جدید طریقے' ہیں_ چھی یو اسی غلطی کا شکار ہوا۔''

یوی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''میں جانتا ہوں۔ کوئی کہتا ہے میرا باپ بھورا ریچھ بن گیا، اور کوئی کہتا ہے، تین ٹانگوں والا کچھوا۔ کچھ لوگ مجھ پر الزام دھرتے ہیں کہ میں شہرت اور دولت کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔ لوگ جو چاہیں کہتے رہیں۔ میں تم لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے پہاڑوں اور جھیلوں کے نقشے تیار کئے ہیں، لوگوں سے رائے لی ہے، مسئلے کو حقائق کی روشنی میں دیکھا اور فیصلہ کیا ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے، ہم آب نکاسی کے نالوں کا نظام قائم کریں گے۔ یہاں موجود میرے تمام ساتھیوں کی بھی یہی رائے ہے۔''

یوی نے ایک ہاتھ سے دونوں جانب اشارہ کیا، سفید داڑھی اور بالوں والے افسر، کھچڑی داڑھی

اور بالوں والے افسر، چھوٹے سے سفید چہرے والے افسر، بھرے بھرے اور پسینے سے تر چہرے والے افسر، موٹے مگر بغیر پسینے کے چہرے والے افسر، غرض سب نے اس سمت دیکھا۔ وہاں سانولے، دبلے پتلے چہروں والے فقیر نما لوگ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ نہ مسکرا رہے تھے اور نہ ہی بول رہے تھے، یوں جیسے لوہے کے بنے ہوئے مجسمے تھے۔

(4)

یوی کے جانے کے بعد وقت گویا پر لگا کر اڑنے لگا۔ ہر بیتنے والے دن کے ساتھ غیر محسوس انداز میں دارالحکومت کی خوش حالی لوٹتی چلی آئی۔ ابتداً کچھ امیر لوگوں نے ملائم ریشم پہننا شروع کیا۔ پھر پھلوں کی بڑی بڑی دکانوں میں سنگترے اور چکوترے بکتے نظر آنے لگے۔ کپڑے کی دکانیں نت نئے ریشم کے تھانوں سے بھر گئیں اور صاحب حیثیت لوگوں کے دستر خوانوں پر عمدہ سویابین کی چٹنی، شارک کے بازوؤں کا شوربا اور سرکہ میں ڈوبے سمندری ککڑی نمودار ہو گئے۔ اور پھر ریچھ کی کھال کے قالین اور لومڑی کی کھال کے استر والی جیکٹیں دکھائی دینے لگیں۔ عورتوں کے کانوں میں سونے کی بالیاں اور کلائیوں میں چاندی کے کڑے بہار دینے لگے۔

نت نئے نظارے دیکھنے کے لئے آدمی کو محض اپنے دروازے پر کھڑے ہونے کی ضرورت تھی۔ کبھی بانسوں سے تو کبھی صنوبر کے تختوں سے لدے ہوئے چھکڑے گزرتے چلے جاتے۔ کبھی کوئی مصنوعی پہاڑیاں بنانے کے لئے طرح طرح کے پتھر لے جاتا نظر آتا اور کسی نے تازہ مچھلی اٹھا رکھی ہوتی۔ بعض اوقات تو ایک ایک فٹ سے زیادہ لمبے کچھوؤں سے لدے ہوئے چھکڑے بھی دارالحکومت کی طرف رواں دواں دکھائی دے جاتے۔ کچھوؤں نے گردنیں اپنے خولوں میں چھپا رکھی ہوتی تھیں اور وہ بانس کے پنجروں میں بند ہوتے تھے۔

''امی! دیکھو تو کتنے بڑے بڑے کچھوے ہیں!'' بچے شور مچاتے باہر نکل کر چھکڑوں کو گھیر لیتے۔

''ہٹ جاؤ، بدمعاشو! یہ شہنشاہ کے لئے ہیں۔ تمہیں اپنی جان پیاری نہیں ہے کیا؟''

قیمتی چیزیں دارالحکومت میں آنے کے ساتھ ساتھ یوی کے بارے میں خبریں بھی چلی آ رہی تھیں۔ لب سڑک درختوں کی چھاؤں میں، مکانوں کے چھجوں تلے بہت سی کہانیاں سننے میں آتیں۔ مقبول ترین کہانی یہ تھی کہ یوی کس طرح رات کے وقت بھورے ریچھ کے روپ میں آیا، منہ اور پنجوں کی مدد سے نو

دریاؤں سے گادنکالی، کسی طرح اس نے آسمانی فوجوں اورآسمانی جرنیلوں کوطلب کر کے شیطان ووچی چھی کو جوسیلاب لایا تھا، پکڑواکرکوہ کچھوا کے نیچے قید کیا۔اب شہنشاہ شون کے معرکوں کی بات کوئی نہیں کرتا تھا،کوئی ذکر ہوتا بھی تھا تو ولی عہدتان چو کے ناکارہ پن کا!

چونکہ ایسی خبریں عرصے سے مل رہی تھیں کہ یوی دارالحکومت واپس آنے والا ہے، اس لئے ہر روز درے کے پاس لوگوں کا ایک ہجوم اس کی سواری دیکھنے اکٹھا ہو جاتا ،مگر ہر روز انہیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔خبریں بہرحال متواتر آرہی تھیں اور مستند بھی تھیں ۔انجام کار ایک ملگجی صبح وہ ہزاروں کے مجمع میں راستہ بناتا ہوا شاہی دارالحکومت چی چو میں آداخل ہوا۔اس کی پیشوائی میں کوئی شاہی نشان نہ تھا۔بس اس کے فقیر نما ساتھیوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب سے پیچھے تھا_ بڑے بڑے ہاتھوں اور پاؤں والا چھریرا سا شخص _اس کا چہرہ سنولایا ہوااور داڑھی بھوری تھی ۔اس کی ٹانگیں قدرے مڑی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھوں میں سیاہ رنگ کا بڑا سا نوکدار پتھر تھا_ شوان کوئی[16] جوشہنشاہ شون نے اسے عطا کیا تھا۔وہ بار بار یہی پکار رہا تھا ،''برائے کرم،راستہ تو چھوڑ دیں!''اسی طرح ہجوم میں دھکا پیل کرتا وہ شاہی محل تک آ پہنچا۔

محل کے دورازے پرلوگوں کے نعرہ ہائے تحسین سے فضایوں گونج اٹھی جیسے دریائے چہہ چیانگ کی گرجتی موجیں!

بوڑھا شہنشاہ شون اژدھا تخت پر بیٹھا تھا۔اس کے چہرے سے کسی قدر خوف اور تھکن کے ملے جلے آثار ہویدا تھے ۔یوی کے اندر آنے پر وہ بعجلت بڑی حلیمی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔علیک سلیک کے بعد وزیرکاؤیاؤ نے کچھ استقبالیہ کلمات کہےاور پھر شہنشاہ گویا ہوا:

''مجھے کچھ دانائی کی باتیں بتاؤ۔''

''کیا کہوں ؟''یوی نے فوراًجواب دیا،''مجھے تو ایک ہی فکر رہتی تھی کہ ہر روز اس پر دباؤ رکھا جائے!''

''دباؤرکھا جائے___اس کا کیا مطلب ہوا؟'' کاؤیاؤ نے استفسار کیا۔

''جب سیلابِ عظیم نے دھرتی پر دھاوا بول کر رکھا تھا اور کوہ ودامن ڈوبے اور گھرے ہوئے تھے تو لوگ پانی میں محصور ہو کر رہ گئے۔''یوی کہنے لگا:''جہاں خشکی تھی، وہاں میں نے گھوڑا گاڑی سے سفر کیا، جہاں پانی تھا وہاں کشتی کا سہارا لیا، کیچڑ میں بے پہیئے کی گاڑی استعمال کی اور پہاڑ راہ میں آئے تو پالکی کام

آئی۔ ہر پہاڑ پر میں نے درخت گرائے اور ای کی مدد سے ہر کسی کو چاول اور گوشت مہیا کیا۔ میں نے کھیتوں کا پانی دریاؤں میں اور دریاؤں کا پانی سمندر میں خارج کیا۔ اور چی کی مدد سے لوگوں کی فوری ضرورتیں پوری کیں۔ جہاں رسد کی قلت پائی، وہاں ان علاقوں سے سامان منگوایا جن کے پاس کچھ فاضل تھا۔ میں نے لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا۔ اور انجامِ کار ہر کوئی امن وچین سے زندگی گزارنے لگا اور امن وامان کا دور دورہ ہو گیا۔''

''خوب! یہ ہیں دانائی کی باتیں۔'' کاؤیاؤ نے تعریف کی۔

''ہاں!'' یوی نے بات جاری رکھی، ''حکمران کو عاقل اور حلیم ہونا چاہئے۔ وہ خدا پر بھروسہ رکھے تو خدا بھی اُس پر اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے۔''

شہنشاہ شون نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور امورِ مملکت یوی کے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ اسے جو کچھ کہنا ہو، بلا جھجک اُس کے منہ پر کہے، پیٹھ پیچھے غیبت نہ کرے۔ یوی نے حامی بھر لی تو شہنشاہ نے ایک اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: ''تان چو کی طرح میری نافرمانی مت کرنا۔ وہ لہو ولعب میں غرق رہتا ہے، انہونی باتیں کرتا ہے اور گھر میں بھی ایسی آفت مچاتا ہے کہ جینا دوبھر کر دیا ہے۔ اس نے واقعی حد کر دی ہے!''

''میری شادی کو چار دن ہوئے تھے کہ میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔'' یوی کہنے لگا: ''میرا ایک بیٹا آٹھ چھی ہے، مگر میں اچھا باپ ثابت نہ ہو سکا۔ یوں میں نے سیلاب پر قابو پایا۔ سلطنت کو پانچ خطوں میں تقسیم کیا جن میں ہر خطے کا رقبہ اڑھائی ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ یہ سلطنت سمندر تک پھیلی ہوئی ہے جس میں 12 صوبے ہیں۔ میں نے پانچ گورنر مقرر کئے ہیں۔ سب کام کے آدمی ہیں سوائے میاؤ کے _ آپ کو اس پر نظر رکھنی ہوگی!''

''یہ سب تمہاری محنتوں کا ثمرہ ہے کہ میری سلطلت میں پھر سے امن وسکون کا دور دورہ ہو گیا۔'' شہنشاہ نے تعریفی لہجے میں کہا۔

تب شہنشاہ اور کاؤیاؤ نے احتراماً سر جھکا لئے۔ دربار برخاست ہونے کے بعد شہنشاہ نے فوراً ایک فرمان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ہر کوئی یوی کی پیروی کرے، ورنہ اُسے سخت سزا دی جائے گی۔

یہ سن کر سوداگروں میں بھگدڑ مچ گئی، لیکن یوی دارالحکومت واپس آنے کے بعد کچھ بدل چکا تھا۔ وہ

گھر میں اب بھی سادہ کھانا کھاتا تھا مگر چڑھاوے چڑھانے کا وقت آتا یا سرکاری تقریبات ہوتیں تو بڑے تزک واحتشام کا مظاہرہ کرتا۔ عام طور پر وہ سادہ لباس پہنتا، مگر دربار میں یا کسی سے جوابی ملاقات کے لئے جاتا تو زرق برق لباس پہن لیتا۔ یوں کوئی کاروبار متاثر نہ ہوا اور تھوڑے ہی عرصے بعد تاجر پیشہ لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ یوی سب کے لئے بڑی عمدہ مثال تھا اور کاؤیاؤ کے نئے قانون بھی بُرے نہیں تھے۔ چہار سو ایسا امن وسکون دیکھنے میں آیا کہ جنگلی جانور بھی خوشی سے ناچ اُٹھے اور قفقس مزے سے اڑتے پھرنے لگے۔

حواشی

1۔قرون اولیٰ کے شاہی خاندانوں سے متعلق ''کتاب تاریخ'' سے ایک قول

2۔نواب کون سیلاب کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہوا ''کوہ پنکھ'' پر مر گیا تھا۔

3۔خیال کیا جاتا ہے کہ وہی نواب کون کا بیٹا تھا۔ وہ سیلابوں پر قابو پانے میں کامیاب رہا اور شون کے بعد تخت نشین ہوا۔

4۔''کوہ ثقافت'' پر عالموں کا اجتماع دوسری انقلابی خانہ جنگی کے زمانے کی بعض ثقافتی شخصیتوں اور کچھ رجعت پسند عالموں کی طرف طنزیہ اشارہ ہے۔ ''کوہ ثقافت'' اکتوبر 1932 کے اس واقعہ کی طرف طنزیہ اشارہ ہے کہ جب چیانگ ھان، لیوفو، سو پینگ چھانگ اور ماہنگ سمیت پچنگ کی تیس سے زیادہ ثقافتی شخصیتوں نے کومتانگ حکومت کو عرض داشت پیش کی تھی کہ پچنگ کو'' شہر ثقافت'' قرار دے دیا جائے۔اس وقت جاپانی سامراجی چین کے شمال مشرقی صوبوں پر قبضہ کر چکے تھے اور شمالی چین سخت خطرے سے دوچار تھا۔ کومتانگ حکومت، دشمن کی اطاعت اور وطن فروشی کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے شمال سے نکلنے اور قدیم ثقافتی نوادرات کو پچنگ سے نانچنگ منتقل کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ چیانگ ہان اور دوسرے لوگوں نے قدیم ثقافتی نوادرات کی اس منتقلی کو روکنے کی کوشش کی۔لیکن ساتھ ہی دعویٰ کیا کہ پچنگ کوئی سیاسی یا فوجی اہمیت نہیں رکھتا اور ایک نہایت بے ہودہ تجویز پیش کی کہ حکومت پچنگ کو ثقافتی علاقہ قرار دے کر اس کا دفاع ترک کر دے۔ انہوں نے درخواست کی کہ ''حکومت جملہ فوجی شعبوں کو پاؤتینگ منتقل کر کے پچنگ کو 'شہر ثقافت' قرار دے دے۔'' یہ بات واضح ہے کہ یہ تجویز نہ صرف بے ہودہ تھی بلکہ اس وقت کی جاپانی سامراجیت کی سازشوں سے بھی مطابقت رکھتی تھی۔ یہ اس

دلیل سے بھی ہم آہنگ تھی جو کومنتانگ حکومت اپنی اطاعت پسندانہ پالیسی کے جواز میں دیتی رہتی تھی۔ کومنتانگ حکومت نے پیچنگ کو ''شہر ثقافت'' تو قرار نہ دیا، مگر انجام کار، اس سے جاپانی سامراجیوں کے حق میں دستبردار ہوگئی۔ 1933 کے اوائل میں بہت سے ثقافتی نوادرات نانچنگ پہنچادئے گئے۔ لوشیون نے 18 ستمبر 1931 کوشن یانگ پر جاپانی قبضے کے وقت سے اپنی وفات تک متعدد مضامین لکھے جن میں کومنتانگ کی قوم سے غداری کو بے نقاب کیا گیا تھا ایسے ہی ایک مضمون میں انہوں نے ''شہر ثقافت'' کی تجویز کو ہدف تنقید بنایا تھا۔ زیر نظر کہانی کے پردے میں انہوں نے ان بیہودہ دلائل کا مضحکہ اڑایا ہے جو چیانگ ھان اور دوسرے لوگوں نے اپنی عرضداشت میں دئے تھے۔ اور بعض ''عالموں'' کو ان معاصر عالموں کے زمرے میں رکھا ہے جو رجعت پسندانہ خیالات کے حامل تھے۔

5۔ مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے بعض نام نہاد عالموں کا مذاق اڑانے کے لئے یہ مکالمہ اصل متن میں بھی انگریزی میں ہے۔

6۔ قدیم چین کے شہنشاہ شون کا ایک افسانوی وزیر انصاف۔

7۔ قدیم چین کے نو صوبوں میں سے ایک صوبہ۔ روایت کے مطابق سیلاب پر قابو پانے کا کام چی چو سے شروع ہوا تھا۔

8۔ طبی جڑی بوٹیوں پر قدیم ترین چینی کتاب۔ اس کے زمانہ تالیف کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ غالباً یہ ھان یا وی ادوار میں مرتب کی گئی تھی اور شن نونگ سے منسوب ہے۔

9۔ قدیم چین کا ایک افسانوی شہنشاہ جو حروف علت کا موجد سمجھا جاتا ہے۔

10۔ قدیم روایتوں کے مطابق چھی یوشمال کے ایک قبیلے چیولی کا سردار تھا۔

11۔ کوڑیاں، قدیم چین میں نقدی کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔

12۔ ایک روایت کے مطابق چھانگ چی شاہی مورخ تھا اور اس نے حروف علت وضع کئے تھے۔

13۔ اس وقت نام نہاد عالم اور حکام ''آبادی میں کمی'' کے لئے ایک دلیل یہ بھی دیا کرتے تھے۔ مثلاً چھن یوان نے جریدے ''ماڈرن ریویو'' کی جلد سوم (شمارہ یکم مئی 1926) میں خاندانی منصوبہ بندی کی اس بنیاد پر بھرپور وکالت کی کہ ''ہماری آبادی میں اب اضافے کی ضرورت نہیں بلکہ موجودہ آبادہ اگر آدھی بھی کردی جائے تو بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' ان دنوں ایسی باتیں اکثر سننے میں آتی تھیں۔

14۔ کنفیوشس کا ایک قول۔

15۔افسانوی مٹی جو بڑھتی تھی اور کبھی ختم نہیں ہوتی تھی۔

16۔کوئی نوکدار یشب ہوتا ہے جو امراء درباری رسوم اور نذر گزارتے وقت اٹھائے رکھتے تھے۔شوان کا مطلب ہے سیاہ۔